اقبالؒ

پروفیسر سمیع الحق

گیانداپرکاشن (پی ڈی) نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

IQBAL

(A collection of Iqbal's Poems & critical study of his work)

Samiul Haque

1988

Jnanada Prakashan
PATNA-800 004 : NEW DELHHI0 00

Publisher :
Jnanada Publishers
PATNA-800 004

Branches :
New Delhi- 24, Daryaganj, New Delhi-110002 Phone : 272047
Arrah - Mahadeva Road, Arrah
Muzaffarpur — Ashok Market, Motijheel, Muzaffarpur
Ranchi — S. N. Ganguli Road, Ranchi Phone : 20769

[All Right Reserved]

New Edition : 1988

Price : Rs. 25,00 only

(c) Publishers

□ Published by Jnanada Publishers, Patna-800 004

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	دیباچہ	۱
۲	پہلا باب	۱۵
	فکر اقبال، سرسری تعارف	۱۷
	مستغربین	۱۷
	اشتمالیت	۱۷
	اشتراکیت پسند	۱۷
	احیا پسند	۱۸
	تالیف پسند	۱۸
	اعیان	۲۸
	آرتھر شوپنہار	۴۴
	فریڈرک نیٹشے	۴۷
	رینے دیکارت	۵۳
۳	دوسرا باب	۵۸
	خودی	۵۸
	مزید تفصیل	۶۲
	خودی کا کام کیا ہے	۶۴
	مقصد	۷۰
	عشق و محبت	۷۱
	اطاعت	۸۵
	ضبط نفس	۸۵
	لا الٰہ الا اللہ	۸۷
	دیگر ارکان	۸۹
	نیابت الٰہی	۹۰
۴	اقبال کا ملی نظریہ	۹۲
	حب الوطن	۱۰۲
	شاہین	۱۰۴
	فلسفۂ جبریت	۱۰۵
	فلسفۂ تشکیک	۱۰۶
۵	تیسرا باب	۱۱۴
	بانگ درا کی فطری نظمیں	۱۱۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	ہمالہ	۱۱۵
	گلِ رنگین	۱۱۸
	عہدِ طفلی	۱۲۰
	ابرِ کہسار	۱۲۰
	ابر	۱۲۱
	ایک آرزو	۱۲۲
	آفتابِ صبح	۱۲۳
	گلِ پژمردہ	۱۲۵
	ماہِ نو	۱۲۵
	پیامِ صبح	۱۲۶
	عشق اور محبت	۱۲۷
	چاند	۱۲۸
	رخصت اے بزمِ جہاں	۱۳۰
	جگنو	۱۳۱
	اخترِ صبح	۱۳۳
	کلی	۱۳۳
	انسان	۱۳۴
	جلوۂ حسن	۱۳۵
	بزمِ انجم	۱۳۵
	سیرِ فلک	۱۳۶
	شبنم اور ستارے	۱۳۷
	ایک شام	۱۳۹
	فراق	۱۴۰
	تنہائی	۱۴۱
	محبت	۱۴۲
	حقیقتِ حسن	۱۴۴
	سرگذشتِ آدم	۱۴۴
	موجِ دریا	۱۴۵
	کنارِ راوی	۱۴۶
	نمودِ صبح	۱۴۷
	چاند	۱۴۷
	نویدِ صبح	۱۴۸
	شعاعِ آفتاب	۱۴۹
۶	بیانیہ نظمیں:-	
	ایک مکڑی اور جالا	۱۵۰
	ایک پہاڑ اور گلہری	۱۵۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	ایک گائے اور بکری	۱۵۲
	ہمدردی	۱۵۴
	ماں کا خواب	۱۵۵
۷	بانگ درا کی نظموں میں کردار نگاری	۱۵۶
	آفتاب	۱۵۶
	زہد و رندی	۱۵۷
	شاعر	۱۵۸
	سوامی رام تیرتھ	۱۵۹
	رام	۱۶۰
	انسان	۱۶۰
	شاعر	۱۶۱
	غلام قادر رہیلہ	۱۶۲
	صدیق	۱۶۳
	عرفی شیرازی	۱۶۴
	نانک	۱۶۵
	بلال	۱۶۵
	بلال	۱۶۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	پھولوں کی شہزادی	۱۶۷
	مرزا غالب	۱۶۸
	داغ	۱۶۹
	شکسپیئر	۱۷۱
	التجائے مسافر	۱۷۱
	بانگ درا کی جذباتی نظمیں	۱۷۳
	ہندوستانی بچوں کا قومی گیت	۱۷۴
	پرندے کی فریاد	۱۷۵
	ترانۂ ہندی	۱۷۶
	نیا شوالہ	۱۷۷
	تصویر درد	۱۷۸
	صقلیہ	۱۸۵
	قطعہ	۱۸۸
	شکوہ	۱۸۹
	حضور رسالت مآب میں	۱۹۵
	جواب شکوہ	۱۹۶
	غرۂ شوال	۲۰۴
۹	دریوزۂ خلافت	۲۰۵

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۹	چوتھا باب	
	بانگ درا کی فکری شاعری	۲۰۶
	عقل و دل	۲۰۹
	شمع	۲۰۹
	طلبائے علیگڑھ کالج کے نام	۲۱۱
	چاند اور تارے	۲۱۲
	کوششِ ناتمام	۲۱۳
	پیامِ عشق	۲۱۳
	عبدالقادر کے نام	۲۱۴
	خطاب بہ جوانانِ اسلام	۲۱۵
	ایک مکالمہ	۲۱۶
	ارتقا	۲۱۷
	شمع و پروانہ	۲۱۷
	بچہ اور شمع	۲۱۸
	..... کی گود میں بلی دیکھ کر	۲۱۹
	سلیمی	۲۱۹
	بچے کی دعا	۲۲۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	صبح کا ستارہ	۲۲۱
	رات اور شاعر	۲۲۲
	شاعر	۲۲۳
	دعا	۲۲۳
	شب معراج	۲۲۴
	پھول	۲۲۴
	وطنیت	۲۲۴
	شمع اور شاعر	۲۲۶
	شمع	۲۲۷
	مسلم	۲۳۳
	شمع اور شاعر کی خصوصیات	۲۳۴
	فردوس میں ایک مکالمہ	۲۳۸
	مذہب	۲۳۹
	پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ	۲۳۹
	خضر راہ	۲۳۹
	شاعر	۲۴۰
	صحرانوردی	۲۴۳
	زندگی	۲۴۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	سلطنت	۲۴۵
	دنیائے اسلام	۲۴۸
	انسان اور بزم قدرت	۲۵۴
	نوائے غم	۲۵۶
	گورستان شاہی	۲۵۶
	فلسفۂ غم	۲۶۰
	والدہ مرحومہ کی یاد میں	۲۶۲
	اسیری	۲۶۸
	طلوع اسلام	۲۶۸
	رفتگان خاک سے استفسار	۲۷۴
	تضمین بر شعر صائب	۲۷۶
	طفل شیر خوار	۲۷۷
	ایک پرندہ اور جگنو	۲۷۸
۱۰	بانگ درا کی چند غزلیں	۲۷۹
	مربوط غزلیں	۲۷۹ تا
	دل، ساقی، میں اور تو	۲۸۱
	حصۂ دوئم	تا ۲۹۷
۱۱	پانچواں باب	۲۹۸

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	معیاری نظمیں	۳۰۰
	وجہ تسمیہ	۳۰۷
	ناظرین سے	۳۰۸
	اسلام اور مسلمان	۳۰۸
	تعلیم و تربیت	۳۳۶
	عورت	۳۴۸
	ادبیات و فنون لطیفہ	۳۵۱
	سیاسیات مشرق و مغرب	۳۶۱
۱۲	ضرب کلیم کی غزلیں	۳۷۱
	محراب گل افغان کے افکار	۳۷۲
۱۳	چھٹا باب	
	اقبال کی چند معرکہ آرا نظمیں	۳۷۹
	فرشتوں کا گیت	۳۸۰
	فرمان خدا	۳۸۰
	گدائی	۳۸۲
	دین و سیاست	۳۸۲
	شاہین	۳۸۲
	لالۂ صحرا	۳۸۳

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	باغی مرید	۳۸۴
	زمانہ	۳۸۴
	فرشتے آدمؑ کو جنت سے رخصت کرتے ہیں	۳۸۵
	روح ارضی آدمؑ کا استقبال کرتی ہے	۳۸۶
	اذان	۳۸۷
	قطعہ	۳۸۷
	محبت	۳۸۷
	ستارہ کا پیغام	۳۸۸
	ابلیس کی عرضداشت	۳۸۸
	لہو	۳۸۸
	پروانہ	۳۸۹
	ملا اور بہشت	۳۸۹
	الارض للہ	۳۸۹
	نصیحت	۳۹۰
	ایک نوجوان کے نام	۳۹۰
	جاوید کے نام	۳۹۱
	بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو	۳۹۱
	جاوید کے نام	۳۹۲
	فلسفہ و مذہب	۳۹۲
	مسجد قرطبہ	۳۹۳
	ساقی نامہ	۴۰۶
	ذوق و شوق	۴۱۳
	زمانہ	۴۲۰
	جبریل و ابلیس	۴۲۲
	قطعہ	۴۲۳
	لینن خدا کے حضور میں	۴۲۴
	بال جبریل کی غزلیں	۴۲۷
	انڈکس	۴۴۳
	تصحیح الاغلاط	۴۴۲

انڈکس

اجتہاد - ۲۶ - ۲۷ ، ۳۱۳

اجتماعیت ۹۲ - ۱۰۴

اسمٰعیل شہیدؒ ۱۹

ام ان رائے ۱۷

آربندو گھوش ۱۸

ارسطو ۲۸

اعیان ۲۸، ۲۹ - ۳۱

الموط (التموت) ۲۴۷

ارتقا - ارتقائیہ ۲۶، ۴۰، ۲۱۷

ابن عبدالوہاب ۲۷

افلاطون ۲۰، ۲۸ - ۳۱

بپن چندر پال ۱۸

برگساں ۲۴ - ۲۵، ۳۱۰

بریڈلے ۲۹

بلالؓ ۱۶۵، ۱۶۶

پین اسلامزم ۱۲

تقدیر ۲، ۳۰۲، ۳۰۹، ۳۲۴

تشکیک ۱۰۶ - ۱۱۳

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ۱۴

ٹیپو ۳۰۴

جمہوری نظام (جمہوریت) ۹، ۲۴۴،
۳۰۶، ۳۶۶، ۳۸۱

جمعیت اقوام ۹

جیمس اسٹوارٹ مل ۱۷

جبریت ۱۰۵ - ۱۱۳

جم (جام جمشید) ۱۱۹

چشتی ۱۷۴

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم } ۳۵، ۳۹،
پیغمبر اسلام مرد کامل } ۷۹، ۸۲،
۱۹۵

حسن ازل ۱۳۲

خواجہ جمال الدین افغانی ۱۲

خودی ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۵۸-۹۱،

۳۰۷، ۴۱۰-۴۱۲

خضر ۲۳۹-۲۴۳، ۲۵۱-۲۵۴،

دورِ وسطیٰ ۲

دے کارت ۳۲، ۵۳-۵۷

داغ ۱۶۹

رحمت علی ۶

رام ۱۶۰

رابندر ناتھ ٹھاکر ۱۸

رانا ڈے ۱۷

زردشت ۲۳

سجاد ظہیر ۱۷

سبھاش چندر بوس ۱۷

سرسید احمد ۱۷

سوامی رام تیرتھ ۱۵۹

اسپینوزا ۳۳۶-۳۳۷

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۳، ۱۹،

۲۲، ۳۳۷

شاہ ولی اللہ ۱۹

شکسپیر ۱۷۰

شیخ الجبال ۲۴۷

شاہین ۱۰۴، ۱۱۳، ۳۸۲

شیلی ۱۲۰

شوپنہار ۲۲، ۴۴-۴۷

شمس تبریز ۷۸

صدیق ۱۶۳

صقلیہ ۱۸۵

طرابلس ۲۰۶

عینیت پسند ۲۰

عشق (وجدان نفس، الہام) ۳۵،

۱۴۱، ۱۷۱، ۱۹۱، ۳۹۴، ۳۹۵،

۳۹۷، ۴۱۵

علامہ ابن سیبویہ ۴۰

عرفی شیرازی ۱۶۴

عقل (عقلیت) ۴۱-۴۲

عمر ۱۶۳

غلام قادر رہیلہ ۱۶۲
فاطمہ بنت عبداللہ ۱۶۱
فردوسی ۱۳۸
فلسفۂ عجم ۱۸ - ۱۹
فلسفۂ افرنگ ۱۸
فلسفۂ اسلام ۱۸
فلسفۂ ہمہ اوست ۲۲، ۲۵
قومیت پرستی ۷
کانگریس ۱۸، ۳۶۲
گوئٹے ۲۲
لبرل فیڈریشن ۱۷
ملت اسلامیہ ۲
مہدی (مہدویت) ۲۳۳ - ۲۳۶
مسلم لیگ ۳، ۵
مرزا غالب ۱۶۸
محمد علی جناح ۶
میکش اکبرآبادی ۲۲
مسولینی ۳۶۷
مذہب ۳۸، ۳۹، ۲۳۰ - ۲۳۱، ۲۳۹
مولانا روم ۴، ۸، ۷، ۲۴۹
میک ٹگراٹ ۳۴
م ک گاندھی ۱۷
نواب کلب علی خاں ۱۷
نہرو پنڈت جواہرلال ۱۷
نیٹشے ۲۲، ۲۳، ۳۲، ۳۶، ۴۷ - ۵۷، ۳۴۵
نپولین ۲۲
نانک ۱۶۵، ۱۷۴
ویدانت ۲۰
ہیگل ۲۰، ۲۵، ۳۱۰
ہرقلیتس ۲۴

تصحیح الاغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۱۳	تقاضے ہیں - ان	تقاضے ہیں ان
۵	۱۰	ہے - مسلمانوں	ہے مسلمانوں
	۱۵	اورہندوؤں	اور ہندوؤں
۶	۶	Fantestic	Fantastic
	۸	اقبال کا وہ پنجاب	اقبال کا پنجاب
	۱۱	رہتے ہوئی	رہتے ہوئے
۷	۴	Autonomous	Residuary Powers
	۶	اندر ہندؤں اور	اندر ہندوؤں اور
	۸	ایک خواختیار صوبہ ہو	ایک خود اختیار Autonomous صوبہ ہو۔
۸	۴	وطن کی بہیتری کے	وطن کی بہتری کے
	۸	See in the	see in it the
۹	۱	کرتا جارہا ہے"	کرتا جارہا ہے۔
	۶	نہیں کرسکتی۔	نہیں کرسکتی"۔
۱۰	۲	دو فطرتوں	دوں فطرتوں
۱۲	۳	پین اسلام جس	پین اسلام ازم جس

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸	۱۶	علمی تحقیقی	علمی تحقیق
۲۱	۸	حکیم افلاطون	(حکیم افلاطوں
	۱۰	ہو گئیں	ہو گئیں)
	۱۴	اس کا	(اس کا
	۱۵	کرتی ہے۔ سے	کرتی ہے۔)
۲۲	۹	جائے کہ کیا اسلامی	جائے کہ اسلامی
	۱۹	اس نے	(اس نے
۲۳	۱	ہو گیا۔ سے	ہو گیا۔)
	۴	اس نے	(اس نے
	۵	کافر ہے۔	کافر ہے۔)
۲۴	۶	دائرہ اسباب وعلل	دائرۂ اسباب وعلل
۲۵	۱۵	وہم وگمان ہیں،	وہم وگمان ہیں
۲۸	حاشیہ	آئندہ صفحہ کی حاشیہ	آئندہ صفحہ کے حاشیہ
۳۰	۷	امثال (یا	امثال یا
	۸	کہتا ہے) ذات	کہتا ہے ذات
۳۱	(حاشیہ)	افلاطول	(صفحہ گذشتہ سے) افلاطوں
	۴ "	کی معرفت کی طرف) رہبری	کی معرفت) کی طرف رہبری
۳۹	۵	Prychic	Psychic
	۱۰	آئی بھی جب	آئی تھی جب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۳	۵	صورت پذیرکوئی	صورت پذیرکوئی
	۱۵	ہم لازماں ہیں	ہم لازمان ہیں
	۱۹	رکھنے پراماده	رکھنے پر آماده
۴۴	۳	زماں ومکاں	زمان ومکان
۴۸	۱	حسین ہے ۔جو	حسین ہے جو
۴۹	۵	امن ۔جوانمردی	امن جوانمردی
		اُجاگر کرتی ہیں	اجاگر کرتی
	۱۷	غلطی ہے ۔جس	غلطی ہے جس
۵۱	۸	وه قدریں ہیں	وه قدریں ہیں
۵۹	۱۲	ایسی کیفیتوں	ایسی کیفیتوں
۶۰	۱۳	ذہن کے بیشمار	ذہن بیشمار
۶۷	۸	اُٹھ جاتو وه مرده	اُٹھ جاتو مرده
۷۱	۱۶	دل ستائی	دل ستانی
۷۲	۱۶	میری پیری کرد	میری پیروی کرد
۷۵	۹	دکھانے سے عبادت	دکھانے سے عبارت
۸۶	۱۵	طمع اورخوف الناکی	طمع اورخوف انسان کی
	۱۶	مٹی ہو یا ہوه	مٹی ہو یا ماده
۸۸	۱۱	کاہرپیکرموجود	کاہرپیکرموجود

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۴	۱۴	براہ راست دالبتہ نہ ہو	براہ راست وابستہ نہ ہو
۹۸	۶	مقصد ہے کہ ایک	مقصد ہے ایک
۹۹	۹	شک نہیں ۔ اسلام	شک نہیں اسلام
	۱۱	مسیحی درما	مسیحی روما
	۱۳	یہ کہ	یہ ہے کہ
	۱۷	انسانیت کا جو عنصر	انسانیت کا عنصر
	۱۸	ہے ۔ عالم	ہے عالم
۱۰۰	۵	قسم کی چیزیں	قسم کی نظمیں
	۹	باتوں کے تفصیل	باتوں کی تفصیل
۱۰۲	۳	اب ان میں تضاد	اب میں ان تضاد
۱۰۳	۱	نظام حیات عمل	نظام حیات جو عمل
۱۱۰	۸	ا طرح فارغ	اس طرح فارغ
	۸	ایسی قوم کو بیدار کرنے سے عمل	ایسی قوم کو بیدار کرنے عمل
	۱۴	دست اموز شاہیت	دست آموز شاہیت
۱۱۱	۸	اپنے بڑوں	اپنے سے بڑوں
	۱۸	خودرا دخود سندزی	خودرا دخور سندزی
۱۱۶	۱	امتحان	امتحان
۱۱۹	۵	ناتوانی ہی	ناتوانی ہی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۹	۷	توسن ادراکِ	توسن ادراک
۱۲۱	۱۴	آج وہ یورپ سے	آج وہ پورب سے
۱۲۴	۶	ایک ہیں تیری	ایک ہیں تیری
۱۲۶	۱۳	بام حرم پہ آکے	بام حرم پر آکے
۱۲۹	۴	سوزاں ہوں میں	سوزاں ہوں میں
۱۳۴	۱۶	سرنستِ مئے	سرمستِ مئے
۱۳۶	حاشیہ	حاشیہ پہ	حاشیہ
۱۳۹	۲-۳	اس صنعت کو یا (اصوات	اس صنعت کو Onomatopaea یا sounechoing sense اصوات
	۷	حروف مذکور کہلاتے	حروف مذکور sibilants کہلاتے
۱۴۱	۱۵	واقفی خوبی	واقعی ——— خوبی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

ہندوستان میں مغلوں کی حکومت کے آغاز سے ہی عام طور پر ذہنی جمود اور بے عملی کا دار دورہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے کئی اسباب کام کر رہے تھے۔ علمی فضا کے اندر دنیاوی زندگی سے بیزاری، تقدیر پرستی اور بھگتی خیالات کا اثر اتنا غالب ہوا کہ لوگ حق و باطل کی معرکہ آرائیوں میں حصہ لینے سے خود بخود کترانے لگے۔ عملی فضا میں تعیش، سہولت کوشی، خوشامد و تملق، ریاکاری و کینہ کا اتنا غلبہ تھا کہ یہ توجیہہ مشکل سے کی جا سکتی ہے کہ بے ثباتیٔ عالم پر اس درجہ ایمان کامل رکھنے والا انسان حُبِ دنیا اور شہوات نفسانی میں کس طرح مبتلا تھا۔ بات اصل یہ ہے کہ فطرت کا ایک مسلمہ اصول ہے، جسے قرآنی اصطلاح میں سنۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان اصولوں میں ہیر پھیر اور تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ اصول ایک دوسرے میں اس درجہ مربوط اور منتظم ہیں کہ جہاں ایک چول ڈھیلی ہوئی، تمام نظام حیات درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب دیکھیے کہ یہی بے ثباتیٔ عالم اور

فنا پذیری کائنات کا تصور ہے۔ جو عرب کے صحرا نشینوں کی زندگی کو اس طرح سے بدل دیتا ہے کہ وہ سارے جہاں کے لیے نمونۂ عمل بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہی تصور دورِ وسطیٰ کے اندر اضمحلال اور حبِّ دنیا کا سبب بنتا ہے۔

ع : ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا

اول الذکر حالت میں لوگوں نے عمل کو ذریعۂ نجات سمجھا۔ یعنی اس دنیائے فانی کی گوناگوں تمناؤں سے دستبردار ہو کر یہ سوچنے کے لئے مجبور ہوئے کہ حیاتِ ارضی کو کس طرح سنواریں کہ آنے والی ابدی زندگی میں حقیقی راحت پا سکیں۔ موخر الذکر حالت میں بے عملی میں راہِ فرار نکالا گیا۔ یعنی یہ زندگی، عالم جو اتنی مرغوب اور پر کشش ہے۔ اس سے چند روزہ مستفید ہونے کا امکان ہے۔ اس لئے جہاں تک بن پڑے اس سے فائدہ اٹھا لو :

ع

بابر بہ عیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست

مگر حیاتِ ارضی کے جو تقاضے ہیں۔ ان کے پورا کرنے کے معاملہ میں یہ خیال لازمی نتیجہ کے طور پر آنا ہی تھا کہ ہم مجبورِ محض ہیں۔ اگر تقدیر میں لکھا ہو گا تو عملِ خیر ہو ہی جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ مصلحین کی ایک جماعت امّت کے زوال کے نقشہ کو دیکھ کر ہر عہد میں متاثر ہوتی رہی۔ سب نے کوشش کی کہ حالات بدل جائیں۔ مگر حالات میں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ البتہ ملّتِ اسلامیہ کا تاریخی رابطہ منقطع نہ ہوا بلکہ انہیں مصلحینِ خیر کی بدولت عہدِ نبوتؐ سے آج تک کی روایت مسلسل

رہی ہیں اس طرح پروئی رہی کہ ملت کی تاریخ لکھنے والوں کو یہ آزادی ہے کہ اگر وہ دور وسطیٰ کی عوامی زندگی سے قطع نظر کریں، تو انہیں کہیں پر بھی خلا کا کوئی گمان نہیں ہوگا۔

ضرورت تھی کہ عوامی زندگی سے غفلت کو دور کرنے کے لئے بیداری کے راگ الاپے جاتے۔ مغلیہ عہد میں شیخ احمد سرہندی نے نعرہ جہاد بلند کیا۔ سوتوں کو جگانے کا کام کیا۔ مگر مضمحل قوم کے قویٰ اس درجہ پژمردہ ہو چکے تھے کہ ان کے اندر صحیح معنوں میں زندگی کے آثار پیدا نہ ہو سکے۔ یوں تو علامہ اقبال نے کہا ہے

ع تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

جس کا مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت مجدد احمد سرہندی کے بعد کوئی مرد میدان پیدا ہی نہیں ہوا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کا تواتر ہمیشہ قائم رہا ہے۔ غالباً اس کی طرف کھلی ہوئی پیشین گوئی قرآن مجید میں موجود ہے جن میں چند آیات اس طرح کی ہیں :۔

اِنَّا نحن نزلنا الذکر وَانا لہٗ لحافظون۔	ہم نے ہی ذکر (تعلیمات قرآنی) کو نازل کیا ہے اور بیشک ہم ہی برابر اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔
وَاللہ متم نورہٖ ولو کرہ الکافرون	اور اللہ اپنے نور کو پایۂ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ چاہے مشرکین اسے ناپسندیدگی کیوں نہ کریں

بہر حال یہ ضرور ہے کہ شیخ مجددؒ کے بعد علامہ اقبالؒ ہی وہ پہلے شخص ہیں

جنہوں سے غفلت سے جھنجھوڑنا برخلاف سہولت سے بیدار ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں سہلانے کے کام کے زیادہ مناسب سمجھا۔ ان کا اس بات پر یقین تھا کہ

ع نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

اس لئے کہ وہ خوب سمجھ چکے تھے کہ ؎

بخاک ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

علامہ اقبال اپنے فکر و فن کے اعتبار سے ایک مکمل ادارہ ہیں ایسی شخصیتیں دنیا کے کسی حصہ میں برابر یا اکثر نہیں پیدا ہوتیں ؎

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

افسوس یہ ہے کہ تقسیم ہند کے ساتھ پاکستانیوں کا یہ دعویٰ کہ اقبال ان کا قومی شاعر تھا اور ہندوستانیوں کے دل میں یہ تذبذب کہ یہی شخص تقسیم ہند کا محرک تھا۔ یہ بات ہندوستانی فضا میں اقبال کے مطالعہ کی اہمیت کم کر گئی۔ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اقبال کے موقف کی صحیح وضاحت کر دوں تاکہ شبہات کا ازالہ ہو سکے:

(۱) یہ صحیح ہے کہ اقبال تادم حیات مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔
(۲) اقبال قومیت کے تصور کے سخت ترین مخالف تھے۔
(۳) اقبال جمہوری نظام کو غلامی سے بدتر تسلیم کرتے تھے۔

۱۹۳۸ء تک مسلم لیگ کا کیا کردار تھا۔ اس کی وضاحت کی چند ان

ضرورت نہیں۔ ہر وہ آدمی جس نے تاریخ ہند کے اوراق کو دیکھا ہوگا۔ اقبال کے عہد تک کی مسلم لیگ کا موقف بھی سمجھ لیا ہوگا۔ مختصراً یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ تقسیم ہند کا تصور بہت بعد کا ہے۔ اس وقت تک مسلم لیگ کا نصب العین (اگر کوئی نصب العین تھا) تو یہی تھا کہ مسلمانوں کی ایک منظم جماعت ہو جو ایک طرف کانگریس کے ساتھ مل کر مطالبۂ آزادی میں حصّہ لے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کر سکے۔ عام طور پر مسلمانوں کے حقوق یہی سمجھے جاتے تھے :-

(۱) پنجاب، سرحد، سندھ، اور کشمیر کو ملا کر ایک خود اختیار۔ (Autonomous) صوبہ بنایا جائے جہاں اس لئے کہ مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مسلمانوں کو اپنی تہذیب و ثقافت کو ترقی دینے کا پورا پورا حق ہو۔ یہ مطالبہ موجودہ پنجابی صوبہ سے بہت مشابہ تھا۔ بنگال اور آسام کا ذکر ہی نہیں تھا۔

(۲) فوج میں نہ بکثرت ہندو بحال کئے جائیں اور نہ مسلمان۔ بلکہ تناسب متوازن ہو۔

(۳) ہر صوبہ کے اندر آبادی کے تناسب سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی سیٹیں مخصوص کر دی جائیں۔

کانگریس کا یہی موقف تھا کہ سارے ہندوستانی متحد ہو کر جنگ آزادی میں حصہ لیں، جن کے جو حقوق ہیں، وہ آزادی کے بعد فیصل ہوں۔ پھر بھی شہریوں کے بہتیرے بنیادی حقوق کی وضاحت ہو چکی تھی۔ بہرحال اقبال مسلم لیگ سے

سے وابستہ رہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی تہذیبی، معاشی اور تعلیمی منصوبہ بندی کی بھی خواہاں تھی۔ اقبالؔ نے ہمیشہ اپنے خیالات کی وضاحت کی۔ مگر کبھی بھی ہندوستان کی سالمیت کی شکست و ریخت کا خیال انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔ یہ تو پنجابی نوجوان رحمت علی تھا۔ جس نے اپنی خیالی کتاب میں پاکستان اور قیام پاکستان کے نظریہ کو پیش کیا تھا اور یہ محمد علی جناح تھے، جنہوں نے اس کتاب کو محض خیالی اُپج (Fantastic) قرار دیا تھا۔

اقبالؔ کا وہ پنجاب کشمیر، سرحد اور سندھ کو ملا کر ایک ثقافتی صوبہ بنانے کا نظریہ ضرور تھا اور اس کی بارہا انہوں نے وضاحت کی تھی انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ چاہے سوراج کے ذریعہ مملکت برطانیہ کے زیر سایہ رہتے ہوئے حق خود اختیاری حاصل ہو یا برطانیہ کے اقتدار سے آزادی مل جائے ہر حال میں:۔

"...... the formation of a consolidated North-West Indian Muslims State appears to me the final destiny of the Muslims atleast of N.W. India."

ایک متحدہ شمال مغربی ہندوستانی صوبہ کا قیام میرے نزدیک معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم شمال مغرب کے مسلمانوں کا آخری نصیب ہو گا۔

یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ نے اپنا مطالبہ رکھا کہ صوبوں کو فیڈرل[1] رکھا جائے۔ اقبال کا خیال یہ تھا کہ جہاں فیڈرل طرز کی حکومت میں مرکز۔ اور صوبہ کی طاقتوں کا الگ الگ شمار رکھا جاتا ہے، وہاں یہ چیز بھی شامل کر دی جائے کہ شمار کے باہر کی باقی ماندہ طاقت (Autonomous) فیڈرل صوبوں کو حاصل ہو، مرکز کو حاصل نہ ہو۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ فوج کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک متوازن تناسب ہو، تاکہ قوت کے توازن میں خلل پیدا نہ ہو۔

اقبال کی یہ تمنا کہ مسلمانوں کا ایک خود اختیار صوبہ ہو۔ ان کے پیچھے ان کا مقصد یہی تھا کہ ایسے صوبہ میں مسلمان اپنی شخصیت اور ثقافت کو بلند کر سکتے ہیں اور انہیں اکثریت کی طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ بنگال اور آسام کے بارے میں ایسا کوئی خیال نہیں رکھتے تھے۔

اقبال کو مغربی انداز کی قومیت پرستی سے ہمیشہ نفرت رہی۔ وہ وطن

---

[1] صوبوں کی تقسیم دو طرح ممکن ہے۔ ایک فیڈرل اور دوسرے یونیٹری یا وحدانی۔ فیڈرل طرز کی حکومتوں میں مختلف صوبے اپنا آئین اور داخلہ انتظام سلطنت کے اصول الگ رکھتے ہیں۔ خارجہ، محکمہ خارجہ وغیرہ مرکز کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ صوبے ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایک متحدہ ریاست ہی بناتے ہیں۔ یہ کنفیڈریشن کی طرح اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ مرکز سے جدا ہو جائیں ۔۔۔ وحدانی ریاستوں میں ساری طاقت مرکزی حکومت کو ہی حاصل رہتی ہے۔

سے محبت کے اس طرح قائل تھے جیسا کہ فطری جذبات کے ماتحت لازمی ہے۔ مگر یہ نہیں چاہتے تھے کہ میکیاولی کے نظریہ کے مطابق اپنے وطن کی عظمت اور برتری کی خاطر عالم میں فریب، عناد اور مکاری کا چلن عام ہو اور ہر اخلاقی گراوٹ کو وطن کی بہتری کے خیال سے روا رکھا جائے۔ دوسری صورت میں وطن ایک بت کا پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ اہل وطن اس بت کی پرستش میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی قومیت کے بارے میں اقبال کا کہنا ہے :-

"I am apposed to it because I see in the germs of atheistic materialism which I look upon as the greatest danger to modern So-ciety"

میں ایسی قومیت کا مخالف ہوں کیونکہ میں اس میں ملحدانہ مادہ پرستی کے عناصر پاتا ہوں اور یہ بات موجودہ معاشرہ کے لئے عظیم ترین خطرہ ہے۔

قومیت کے ایسے نظریہ سے انسانی برادری کا تصور مجروح ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ قومیت وطنیت کا دوسرا نام ہے۔ اگر قومیت کی کوئی بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ مذہب بالخصوص تصور ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کا رابطہ انسان کی فطری ترکیب میں شامل ہے۔ میکیاولی بقول اقبال کے شیطان کا نمائندہ تھا۔ اسی نے وطنیت کے تصور کو ایجاد کیا۔ اقبال کہتے ہیں۔ "مجھ کو معلوم

ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ خدا اس صداقت کو زیادہ عالمگیر کرتا جا رہا ہے۔"

کہ اسلام کا تصور قومیت پرستانہ یا شہنشاہی کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوام) ہے۔ اسلام میں مصنوعی حدبندیوں کو اس حد تک تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس سے شناخت کی آسانی ہوتی ہے۔ لیکن کوئی سرحدی حدبندی انسان کے معاشرتی دائرہ کی وسعت کو منقطع نہیں کر سکتی۔

اقبال کو جمہوری نظام سے بھی اختلاف ہے کیونکہ یہ نظام بھی شہنشاہی یا مطلق العنانی نظام کی طرح ہے۔ اس میں صالح افراد کی تربیت کے مواقع نہیں ہوتے۔ مغربی پارلیامانوں میں سوائے جنگ و جدال کے اور کیا ہے وہاں مختلف پارٹیاں اپنی غرض کو پورا کرنے کے لئے برسرپیکار رہتی ہیں۔ اقبال کو یہ تسلیم ہے کہ جمہوری نظام بہتر ہو سکتا ہے۔ مگر انسانی فطرت اس کے خلاف ہے۔ اس لئے جمہوری نظام کا قیام ناممکن ہے۔ آدمی ایک نہ ایک دن کسی قیصر یا سکندر کے سامنے سرنگوں ہو ہی جاتا ہے۔

متاع معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبع سلیمانی نمی آید
گریز از طرز جمہوری غلامے پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

دنیا کے ہر تمدنی نظام میں بندہ و آقا کا رشتہ قائم ہے۔ بندگی کے لئے آقایان سلطنت عوام الناس کو تیار کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل

اقبال کے مطابق ایک قسم کی ساحری ہے۔ بندہ و آقا دونوں غرض کے تابع ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ آقا اپنی عقلمندی سے بندوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ دو فطرتوں کی یہ جماعت ان کے سامنے سر بسجود رہتی ہے۔ لیکن نظام عالم درہم برہم رہتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلامی معیار سلطنت ہے جس میں برتری صرف ذات واحد یعنی خدائے مطلق کو ہے۔ کسی اور کو خواجگی کا حق نہیں۔ کیونکہ اسلامی اصول کے مطابق : ع

نماترا اثنی خواجہ از برہمن کافرتری

پوری ملت اسلامیہ آئین دین یعنی احکام قرآنی کے رشتہ میں منسلک ہوتی ہے۔ ذاتی غرض کی بندگی بھی نہیں ہوتی اور مفاد پرستی بھی نہیں۔ اس نظام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں معاشی زندگی میں ربٰو یا سود کی اجازت نہیں ہے۔ سود خواری، خود پرستی کو پروان چڑھاتی ہے، جب کہ ایک اعلیٰ سوسائٹی کی بنیاد کے لئے ذاتی مفاد کو قربان کرنے کا جذبہ ضروری ہے۔ جب افراد کی زندگی میں ایثار و قربانی کا جذبہ پروان چڑھ جائے، تو یقینی طور پر کوئی کسی کو اپنے مفاد کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ یہی وہ مزاج ہے جس کی رو سے اسلامی سیاست دنیاوی سیاست سے ممیز ہوتی ہے۔

ضرورت تھی کہ اقبال کے افکار و شاعری سے عوام الناس کی بالعموم اور نوجوان طالب علموں کی بالخصوص دلچسپی قائم رکھا جائے، کیونکہ اقبال

نہ صرف گذشتہ تین سو برسوں کے اندر عالم اسلام کے سب سے بڑے مفکر ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کے افکار سے عام خلق اللہ کی بھلائی ممکن ہے۔

عام طور پر لوگ اقبالؔ کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں حُب الوطنی کے قائل تھے رفتہ رفتہ حب الوطنی کے مخالف اور اسلامیت کے قائل ہوتے گئے۔ مجھے ایسی بے سروپا باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں۔ اقبالؔ کیا ہر وہ آدمی جو معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہے۔ وطن سے اپنی محبت ضرور رکھتا ہے اور رکھے گا۔ اقبالؔ نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبالؔ کی شاعری شروع سے آخر تک منظم افکار کی نمائش ہے کہیں نہ کوئی جملہ معترضہ اور نہ کہیں گریز۔ البتہ شعور و وجدان کی پختگی کا احساس ہوتا ہے، جو بتدریج ظاہر ہوتا گیا ہے۔ شروع ہی میں جب وہ فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ یا غیر ملکی نظموں کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ تو اسی وقت ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت کے نقوش کو کتنا واضح پیرایۂ بیان مل گیا۔ دوسرا حصہ وہ ہے جب وہ فطرت کے مناظر کا مطالعہ انسان بلکہ کائنات کی فطرت کے مطالعہ کے طور پر کرتے ہیں۔ اس حصہ میں ان کے دل کے اندر جانے کی بےچینی پائی

جاتی ہے اور پھر مربوط اور منظم افکار جن کے تانے بانے اسلامی نظریہ حیات سے ماخوذ ہیں، کا دور آتا ہے۔ بعض لوگ پین اسلامک عہد کی شاعری اور آئندہ کی پختہ شاعری کے اندر بھی فرق کرتے ہیں۔ دراصل پین اسلام ازم کے محرک خواجہ جمال الدین افغانی تھے اور جن سے اقبال کے نہ صرف رابطے تھے۔ بلکہ انہوں نے پین اسلامک سیاست کے پس منظر میں چند نظمیں جن میں خضر راہ سب سے مقبول نظم ہے لکھیں۔ مگر نہ یہ اقبال کے اپنے طرز فکر سے علٰحدہ کہی جا سکتی اور نہ بعد کی پختہ نظموں سے انہیں اس لئے الگ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں فنی ناپختگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی منظم اور مربوط شاعری کو ادوار میں تقسیم کرنا میری نظر میں بدذوقی ہے۔

مجموعہ زیر نظر کی ترتیب ایک نئے ڈھنگ سے کی گئی ہے اس کے تین حصے ہیں۔ بانگ درا کا حصہ، ضرب کلیم کا حصہ، اور بال جبریل وارمغان حجاز کا حصہ۔

بانگ درا کے حصہ کی ترتیب یوں قائم کی گئی ہے:-

(۱) فطری نظمیں (۲) ایسی فطری نظمیں جن میں شاعر اپنی شخصیت کو فطرت سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ (۳) تخیلی مناظر (۴) بیانیہ نظمیں۔ (۵) کردار نگاری (۶) جذباتی نظمیں (۷) فکری نظمیں اور (۸) منتخب غزلیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ شاعر کی بالیدہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل

ہے۔ ان میں ضرب کلیم کی نظموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی ترتیب نہیں رکھی گئی۔ کوشش صرف یہی رہی ہے کہ کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جا سکے۔ خدا کرے کہ قارئین کی اس کتاب کی بدولت اقبالؔ تک رسائی ہو سکے۔

سمیع الحق

رانچی
۱۵ر جون ۱۹۶۶ء

پہلا باب

فکرِ اقبالؒ — سرسری تعارف

اُنیسویں اور بیسویں صدی میں جس قدر مفکرین ہندوستان (وہ ہندوستان جو آج بھارت اور پاکستان ہے) میں پیدا ہوئے، ان کے خیالات کے تانوں بانوں کی کرید کی جائے، تو وہ سب کے سب مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے مفکرین زیادہ تر انہیں تین دبستانوں میں سے کسی ایک سے وابستہ ہے۔

(ا) **مستغربین** — یہ لوگ زندگی کے سارے مسائل کا حل مغربی تمدن و معاشرت میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ مشرق میں رہتے ہوئے دلی طور پر مغربی دنیا سے وابستہ ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن سراپا مغربی تہذیب و تمدن کا عکسی پیکر ہو۔ مستغربین کے تین فرقے ہیں (الف) حریت پسند (ب) اشتمالیت پسند اور (ج) اشتراکیت پسند — رانا ڈے، گوکھلے، سر نیلرناتھ بنرجی، نواب کلب علی خاں اور لیبرل فیڈریشن کے زعماء کا شمار حریت پسندوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ جیمس اسٹوارٹ مل سے رہبری حاصل کرتے ہیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو، سبھاش چندر بوس، اچاریہ نرندر دیو وغیرہ کا شمار اشتمالیت پسندوں میں ہے جبکہ ام ان رائے

سجّاد ظہیر وغیرہ۔ اشتراکیت پسندی کے نمائندے ہیں۔ اشتمالیت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں، کا رہبرِ اعظم کارل مارکس ہے۔

(۲) احیا پسند۔ ان لوگوں کی اصلیت مشرقی تہذیب وتمدّن سے وابستگی ہے۔ م۔ک، گاندھی اور تلک کی وابستگی ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے ہے۔ جبکہ شیخ محمد اقبال حجاز عہدِ نبوی کو اپنا مرکزی مقام تسلیم کرتے ہیں۔ احیا پسندوں کے دبستان سے جس کا بھی تعلق ہے۔ وہ مغرب کے معاشرتی اور معاشی اداروں کی سختی سے تنقید کرتا ہے۔

(۳) تالیف پسند:۔ یہ لوگ مغرب سے عقیدت رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مغربی تصورات کو مشرقی تہذیب و ثقافت سے ہم آمیز کریں۔ مستغربین کے برخلاف ان کا منبع اصلی مشرق ہی ہے لیکن احیا پسندوں کی طرح مغربی تہذیب و تمدّن سے دامن بچانے کا رجحان نہیں رکھتے۔ اس نظریہ کے اہم ترین رہنماؤں میں سرسیّد احمد، رابندرناتھ ٹھاکر، بپن چندرپال اور آربندو گھوش کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

علّامہ اقبال کے زیرِ مطالعہ فلسفہ، افرنگ، فلسفہ، اسلام اور فلسفہ عجم (ہندی، ایرانی اور یونانِ قدیم کا فلسفہ) سبھی رہے ہے۔ فلسفہ، افرنگ سے یک گونہ متاثر ہوئے بلکہ علمی تحقیقی اور اجتہادات میں اس سے کافی فائدہ بھی اٹھایا۔ اس کا انہیں اعتراف بھی تھا، چنانچہ فرماتے ہیں :۔

ع ’خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ،‘

(افرنگی حکما کے درس نے ہماری علمیت کو بڑھانے میں کافی مدد دیا) لیکن فلسفۂ عجم کو قبول کرنے سے کافی احتیاط برتا ہے۔ فلسفۂ عجم کا اثر ابتدائے عہد سے ہی فلسفۂ اسلام پر پڑتا رہا۔ اقبالؔ کا کہنا ہے کہ اس سے اسلامی زندگی کی سادگی اور عملی جدوجہد کی سرگرمی کو کافی نقصان پہنچا۔ چنانچہ ان کی ساری کوشش اسی بات پر مرکوز رہی کہ وہ خالص اسلامی تمدّن کے تصوّر کو پیش کر سکیں اور فلسفۂ عجم کے اثرات سے اس کو پاک کریں۔ ایسی ہی کوشش حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے عہدِ جہانگیر میں کی تھی اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ اقبال کا روحانی واسطہ حضرت مجدّد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، اسمٰعیل شہید وغیرہ سے ملتا ہے۔ اس پورے سلسلہ کی خصوصیّت یہ ہے کہ یہ لوگ آئیڈیل معاشرہ کے طور پر خالص عہدِ نبویؐ کی زندگی اور اوائل اسلام کے تمدّنی ڈھانچہ کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اسی طرزِ حیات کی طرف مراجعت انسانی فلاح و بہبودی کا ضامن ہوگا۔ اقبالؒ کا خیال تو یہ بھی ہے کہ عہدِ نبویؐ میں جو کیفیت عرب کے ریگستانی ماحول کی تھی وہی حقیقی معنوں میں ایک آئیڈیل سوسائٹی کو جنم دے سکتی ہے۔ "عرب کے ریگستانوں اور نخلستانوں کے اوپر غور کرنے سے پتہ چلے گا کہ حقیقی معنوں میں یہی وہ سرزمین ہے، جہاں مشکل پسندی اور مجاہدہ کی زندگی کی صحیح ثقافت جنم لے سکتی ہے۔" ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

دراں شب ہا خروش صبح فرداست
کہ روشن از تجلیہائے سیناست

(اس کی راتوں میں آنے والی صبح کا ہنگامہ ہے۔ کیونکہ وہ طور سینا کے جلووں سے روشن ہے)

۵ تن و جاں محکم از باد درو دشت
طلوع امتاں از کوہ و صحراست

(ریگزاروں کی ہوا سے جسم و روح قوی ہوتی ہے۔ قوموں کا آفتاب کوہ و صحرا سے طلوع ہوتا ہے)

ثقافت اسلامیہ کا تاریک ترین عہد وہ ہے جب اس کا رابطہ عجمی تہذیب و تمدّن سے قائم ہوا۔ ایرانی ثقافت نے مکمل طور پر روحِ اسلام کو متغیّر کر کے رکھ دیا۔ عربوں کی جوانمردی اور سادگی عبارت ہے عمل اور جہدِ مسلسل کی زندگی سے۔ یہی عمل اور جہدِ مسلسل کی زندگی ایرانی تمدّن کے تکلّفات سے ملوث ہوئی، تو تن آسانی، عشرت پسندی اور جبریت کی پابند ہو گئی۔ عربوں کے اخلاقی فلسفہ کو "شیری" اور "شاہینی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یونانی اور ایرانی افکار گوسفندی اور میشی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اقبال کو ویدانت کے فلسفہ سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں سارے کا سارا فلسفۂ تمدّن ویدانت کا مرہونِ منت ہے۔ اقبال کی

علیت پسند (Idealist) فلاسفہ کی بھی سخت ترین مذمت کرتے ہیں چنانچہ حکیم افلاطون (جو علیت پسندوں کا معلم اول سمجھا جاتا ہے) کے بارے میں ان کا خیال ہے: کہ

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گوسفندانِ قدیم
قومہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

حکیم افلاطون پرانا راہب تھا، جو اگلے زمانہ کے گوسفندوں میں سے تھا۔ اس کی شراب کے زہریلے اثرات سے بہتری قومیں غفلت میں مبتلا ہوگئیں اور ذوق عمل سے محروم ہوگئیں۔

اسی طرح ہیگل کے بارے میں ان کا خیال ہے:-

حکمتش معقول با محسوس در خلوت نہ رفت
گرچہ بکر فکر او پیرایہ پوشد چوں عروس

اس کا عقلی فلسفہ حقایق محسوس سے ہم کنار نہ ہوسکا۔ اگرچہ اس کی دوشیزۂ فکر شادی کے جوڑے زیب تن کرتی ہے۔

طائرِ عقلِ فلک پرواز او دانی کہ چیست
ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس

آسمان پر پرواز رکھنے والے اس کے طائر فکر کے بارے میں جانتے ہو کیا ہے؟ وہ مرغی ہے، جو زورِ مستی میں بغیر مرغا کے انڈے دیتی ہے۔

دراصل اقبالؔ فلسفۂ ہمہ اوست کی ہر صنف سے اختلاف رکھتے ہیں یہ صحیح ہے کہ ابتدائے اسلام سے ہی عام ازیں کہ فقہا ہوں یا متکلمین وحدت الوجود (ہمہ اوست) کے عجمی نظریہ سے اُلجھتے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تصوّر بہت ہی الجھ کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ نظریہ روح اسلام کے خلاف ہے۔ نقدِ اقبالؔ میں میکش اکبر آبادی نے اس مضمون کو زیادہ سے زیادہ الجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ بیشتر حوالے جو مجدّد الف ثانی کے مکاتیب سے دیئے گئے ہیں انہیں بہت زیادہ توڑ مروڑ کر قاری کو گمراہ کیا گیا ہے۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود اگر میکش صاحب سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا اسلامی نقطۂ نظر سے "کائنات عین اللہ ہے"؟ یا "کائنات ماسوا اللہ ہے"۔ تو ان کا جواب کیا ہوگا بہرحال اگر زمانہ نے موقع دیا، تو اس موضوع پر آئندہ بحث کی جائیگی۔

افرنگی فلاسفروں میں نیٹشے کا اثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ نیٹشے کے اکثر ہیرو اقبالؔ کے بھی ہیرو ہیں۔ مثلاً گوئٹے، نپولین، شوپنہار۔ نیٹشے کی طرح اقبالؔ کا بھی خیال ہے کہ تاریخ کے پیش نظر جو غایت ہے وہ شخصی کمال کا حاصل کرنا ہے۔ اس کے باوجود اقبالؔ نے نیٹشے کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

افگند در فرنگ صد آشوب تازہ
دیوانۂ بکارگہ شیشہ گر رسید

اس نے افرنگ میں سینکڑوں نئے آشوب پیدا کر دیئے، گویا ایک دیوانہ

شیشہ ساز کارخانہ میں داخل ہو گیا۔ ؎

آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

اس نے حرم کی بنیاد پر بتخانہ کی تعمیر کی۔ اس کا دل مومن ہے لیکن اس کا دماغ کافر ہے۔

اقبالؔ اور نیٹشے کے مابین اہم اختلافات ہیں۔ نیٹشے کی زبان میں زردشت کہتا ہے:-

"Destroy for me the good and the just for only the Strongman will be truthful"

میرے لئے نیکی اور عدل کو فنا کر دو۔ کیونکہ مضبوط آدمی ہی حق پسند ہو گا۔

اقبالؔ ہمدردی، انصاف اور نیکی جیسے تمام انسانی اقدار کو برقرار رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ نیٹشے کے مطابق حیات محض قوت کو بڑھانے کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ ورنہ کائنات کا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ لیکن اقبالؔ کے مطابق کائنات کی غایت ہے اور وہ یہ کہ انسانی خودی کی تعمیر و تکمیل ہو۔ نیٹشے کا تصور ہے کہ تہذیب ایک دائرہ میں گردش کرتی ہے۔ اقبالؔ گردش کے تصور کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ وقت دائمی طور پر رواں دواں ہے اور ہمیشہ آگے کی اور بڑھتا رہتا ہے۔

اقبال پر فرانسیسی فلسفی برگساں کا بھی اچھا خاصا اثر ہے۔ وہ بھی قدیم فلسفی ہرقلیطس کی طرح اس بات کا معتقد ہے کہ از روئے کائنات حق کون نہیں بلکہ تکوین ہے یعنی کائنات کی شکل پہلے سے منتظم اور ترتیب یافتہ نہیں ہے۔ بلکہ لحظہ بہ لحظہ تشکیل پاتی ہوئی کائنات تکمیلِ ترتیب اور تنظیم کی طرف تدریج بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن برگساں کا خیال ہے کہ حقیقت کسی علت غائی کی پابند نہیں ہے۔ یعنی یہ تصور کہ ہر شے دائرہ اسباب و علل میں کسی غایت یا مقصد کی تکمیل کی پابند ہے۔ برگساں ایسے نظریہ کو ماننے کے لئے اس بنا پر تیار نہیں کہ علت غائی کی کارفرمائی کو تسلیم کر لینے کے بعد زمان کو غیر حقیقی تسلیم کرنا ہوگا۔ حالانکہ زماں ایک حقیقت ہے۔ اس لئے اگر زمان کو غیر حقیقی قرار دیا گیا، تو گویا حقیقت کو ہی غیر حقیقی مان لیا گیا۔ اقبال برگساں کے اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ " اگر غایت سے یہ مراد ہے کہ پہلے سے کسی بنے بنائے منصوبہ کی تکمیل کی جائے، تو زمانہ غیر حقیقی ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ زندگی میں نت نئے مقاصد کی تخلیق جاری و قائم رہے تاکہ وہ اپنا تحقق کرے، تو زماں کی نفی لازم نہیں آتی۔"

اقبال، برگساں سے اس لئے بھی اختلاف کرتے ہیں کہ اس کے مطابق حیاتیت، یعنی حیات کی آفرینش کسی کیمیاوی یا طبعی اصول پر نہیں ہوئی۔ بلکہ اصول نمو کے ماتحت ہوئی۔ اس کا یہ تصور ارادہ اور فکر کی ثنویت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ برگساں نے

شعور و ادراک کے متعلق ایک جزوی نظریہ ہی قائم کیا تھا۔ اسی وجہ سے اس سے ایسی لغزش سرزد ہوئی۔ کیونکہ برگساں کا خیال ہے کہ شعور کے اندر صرف یہی صفت ہے کہ وہ تحلیلی اعمال کو انجام دے۔ تحلیلی اعمال کو انجام دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ذہن کے اندر جو نقوش تیرتے ہوتے ہیں وہ خود ہی تجربہ کے اندر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ شعور ان کو الگ الگ مگر ایک دوسرے سے متصل برقرار رکھنے کے لئے ہر ایک پر مختلف نشان لگا دیتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ برگساں کی یہ بھول ہے۔ شعور صرف یہی نہیں کرتا کہ زندگی کے نقوش کو الگ الگ کرتا ہے۔ بلکہ مختلف نقوش کو ایک دوسرے میں جوڑ کر ہم آہنگ بھی کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ شعور کے اندر نمو کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی کہ خود حیات کے اندر۔

اقبال اور برگساں دونوں کا خیال ہے کہ حقیقت دراصل تکوین یا تغیر کا ایک مسلسل قاعدہ ہے۔ یہ کبھی ختم نہ ہونے والا بہاؤ ہے۔ یہ حالت کون نہیں ہے، یعنی پہلے سے متعین شدہ انفرادیت کا نام حقیقت نہیں جو ہمیشہ کے لئے مقرر ہے۔ بلکہ تخلیق کا عمل بطور امکان کے جاری ہے۔ ہیگل کے مطلق کا تصور، ہندو متکلمین کا برہمہ صوفیوں کا ہمہ اوست سب کے سب طلسم وہم و گماں ہیں، یا دوسرے لفظوں میں کسی مجذوب کا ذہنی ہذیان۔ کائنات کے اندر جو ترتیب و توافق پایا جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے نہیں ہے اور نہ اپنے تئیں مکمل ہے۔ یہ دراصل شعوری یا وجدانی کوشش کا نتیجہ ہے۔ ہم لوگ بتدریج غیر منتظم عالم سے عالم کون کی طرف بڑھتے

ہیں اور اپنے اس عمل میں ہم مجبور ہیں۔ پس، کائنات کوئی مکمل عمل نہیں ہے ازل سے آج تک اس کی صورت پذیری جاری ہے۔ لہٰذا کائنات کے بارے میں حقیقت کاملہ کا تصور ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اب تک کائنات ہمارے سامنے کُل کی شکل میں جلوہ گر ہی نہیں ہوئی۔ تخلیق کا عمل جاری ہے۔ جس میں انسان بھی سہیم کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کم سے کم وہ غیر منتظم عالم کے ایک حصّہ کی ترتیب درست کرتا ہے۔

جہاں او آفرید ایں خوب تر ساخت
مگر با ایزد انباز است آدم

اُس نے جہان کو پیدا کیا اور اس نے اسے مزید خوشنما بنا دیا شاید آدم اللہ کا شریک کار ہے۔

اقبال کے خیالات ارتقائین کے خیالات سے ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اسی قدر ہے کہ اقبال تغیرّ وارتقا کو واجب الوجود کی کلیت میں موجود مانتے ہیں اور متبدل مظاہر کو اسی کلیت کی ہر لحظہ گوناگوں شان میں جلوہ آرائی قرار دیتے ہیں۔ اقبال کا تصوّر ہے کہ کائنات کو حرکی (Dynamic) تسلیم کرنا اسلامی تصوّر ہے اور یہ تصوّر خالص اسلامی ہے۔ کلاسیکی تصور کے مطابق کائنات سکونی (Static) ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر کلاسیکی نقطۂ نظر کے عین مخالف ہے۔ اسلام کی ترکیب میں ہی اصول حرکت کی کارفرمائی ہے۔ اسی اصول حرکت کا نام اجتہاد ہے۔ اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں۔ اسلامی فقہ کی رُو سے اجتہاد دینی

مسائل میں اس طرح غور و خوض کرنا ہے کہ آئے دن ادلتی بدلتی دنیا میں جو نئے حالات اور نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کے پیش نظر اسلامی دستور حیات کے نفاذ و اجراء کے اصل رُخ کو پہچانا جاسکے۔ اجتہاد کا عمل صحابہ کرام رضؓ کی زندگی سے ہی جاری ہے۔ ائمہ سنت نے وقتاً فوقتاً شرعی مسائل کی تشریح کر کے نئے حالات کے پیش نظر دینی تکلفات کی ترجمانی کی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں ابن عبدالوہاب کی مثال نمایاں ہے۔ اس ہر لحظہ ادلتی بدلتی دنیا میں اصول اجتہاد کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں نشاۃ ثانیہ ممکن ہے، لیکن اجتہاد فقط مردان حُر کا خاصہ ہے: غلام اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ موجودہ اصلاحات کی جد و جہد میں جو اجتہادات کئے جارہے ہیں عین ممکن ہے کہ وہ روح اسلام کے منافی ہوں۔ کیونکہ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔ آج تفریق یعنی امتیاز رنگ و نسل اسلامی زندگی میں ہر عہد سے زیادہ قوی صورت میں رونما ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ یہ تفریق اس نقطۂ نظر کا خاتمہ نہ کردے جو انسانی پیمانہ پر ایک وسیع المشرب نقطۂ نظر کا ہونا چاہیئے۔ انسانی پیمانہ پر وسیع نظری کا تصور ابتداً اسلامی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ آج جو مذہبی و سیاسی اصلاح پسندی کی گرما گرمی ہے، کہیں یہی گرمی اصلاح کو اس کے حدود سے آگے نہ کھینچ لے جائے۔ اصلاح کے نتیجہ میں یورپ میں کلیسائیت کا جو حشر ہوا اس سے مسلمانوں کو سبق لینا چاہیئے۔ یہ اصلاح سیاسی اصلاح کی شکل میں ظاہر ہوئی اور کلیسائیت کے عالمگیر اخلاقیات

کو قومی اخلاقیات میں تبدیل کر گئی۔ اس کے سبب سے خطرناک نتائج یورپ میں بین الاقوامی حالات کے پیش آجانے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔

انہیں بنیاد پر اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ کائنات حرکی ہے اور ارتقا کا عمل ہر وقت جاری ہے۔ پھر بھی غلامی کے زمانہ میں تقلید ہی پسندیدہ فعل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ غلامی میں خیر و شر کی تمیز کی پرکھ اٹھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ انتہائی خطرناک بات ہوگی اگر غلام اجتہاد کے ذریعہ مسائل دینیہ کا تازہ مفہوم ڈھونڈھے۔ زمانۂ حاضر میں مسلمانوں کی نفسیات اس صلاحیت کی حامل نہیں ہے۔ ویسے ہر عہد میں اجتہاد کی ہر کوشش سے پہلے قدم کو بہت پھونک پھونک کر رکھنا ہی مناسب ہے ورنہ لغزشوں کی طرف مائل ہونے کے قرائن ہمیشہ غالب ہیں۔

اقبال اور ارسطو اس بات پر متفق ہیں کہ محض محسوس ہی دنیا کے اندر حقیقت ہے۔ یہ خیال افلاطون کے اعیان[۱] (*Ideals*) اور عالمیت (*Universals*) کے تصور کے خلاف ہے۔ اقبال اور افلاطون کے

---

[۱] اعیان:۔ یونانی فلاسفہ میں بہتیروں نے صداقت کے وجود پر شبہات ظاہر کیا تھا ہرقلیتس نے علم کی اضافیت پر کافی زور دیا تھا۔ افلاطون بھی اس نظریہ سے کافی متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے علم کی یوں تعریف کی:۔ "علم نام ہے دنیائے مظاہر و تغیرات کی صحیح تفصیل کا جیسا کہ حواس پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس تعریف سے تذبذب اور تشکیک کو فروغ ہوتا ہے، اس لئے کہ حواس پر ظاہر ہونا ایک اضافی امر ہے (باقی آئندہ صفحہ کی حاشیہ پر)

اعیان کے تصور کو طلسم خیال سے تعبیر کرتے ہیں۔ مشاہدہ کے متناہی مراکز یا انفرادی طور پر موجودات کا مطالعہ بریڈلے کے مطابق اضافیت کے جراثیم سے اس طرح پُر ہے کہ علم کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن

(صفحہ گذشتہ سے) اس کے باوجود افلاطون کا یہ عقیدہ تھا کہ صداقت کا وجود ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب عالم مظاہر شک و شبہ سے معمور ہے، تو وہ صداقت جو دائمی اور مستقل ہے کیا ہے؟ (یہاں پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اقبال عالم مظاہر کی صداقت کے قائل ہیں اور اس امر میں ارسطو کا بھی اتفاق ہے۔ اقبال کے مطابق عالم محسوس کی ہر شے کا گہرا مطالعہ صداقت اور حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی مواد فراہم کرتا ہے۔ افلاطون منفرد اشیاء کا مطالعہ غیر اہم سمجھتا ہے اگر حواس کے مشاہدہ سے کام لیا گیا ہو۔ کیونکہ حواس کے مشاہدہ میں پے بہ پے تبدیلیاں آتی ہیں اور فکر کے اندر تضاد کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس لئے ہم صرف اشیاء کی عام فطرتوں کے خصائص کا مطالعہ کر کے حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں)

افلاطون کہتا ہے کہ ہم آئے دن جن منفرد اشیاء کو دیکھتے ہیں۔ ان میں متضاعف اور متغیر ہونے کی صلاحیت ہے۔ ان منفرد اشیاء کا عالم عالم حواس و مشاہدہ ہے اس میں صرف شک اور تذبذب پایا جاتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے علم قطعی حاصل نہیں ہو سکتا۔ عالم حواس و مشاہدہ میں ہمہ دم تغیر پیدا ہوتا ہے اور اس میں اتنا ٹھہراؤ ہوتا ہی نہیں کہ ان کو جاننے یا پہچاننے کا قابل قدر میزان دریافت کیا جا سکے۔ لہٰذا عالم حواس، عالم مظاہر ہیں، جہانِ حقیقت نہیں۔ (باقی آئندہ صفحہ کی حاشیہ پر)

اقبال کہتے ہیں کہ یہی انفرادی وجود کائنات کی بنیادی حقیقتیں ہیں اقبال افلاطون کو "از گروہ گوسفنداں" قرار دیتے ہیں۔ تو صرف اسی وجہ سے کہ وہ عالم مظاہر کو غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ عالم مظاہر زندگی کو محبوب ہے اور اعیان کا خیالی عالم مردہ ارواح کے لئے پسندیدہ ہے۔ جملہ حیات انفرادی ہے اور عالمی حیات کوئی چیز نہیں ہے (یہ بات یاد رہے کہ صوفیا میں سے کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جوہر ذات الٰہی ہے۔ امثال (یا جیسے افلاطون اعیان کہتا ہے) ذات الٰہی کے اعراض ہیں اور اس طرح عالم محسوسات جہاں منفرد اشیا کا ہی وجود ہے، امثال کے اعراض ہیں) اللہ بھی ایک ذات ہے۔ اگرچہ وہ جملہ موجودات سے بالکل ہی منفرد ہے۔ محسوس پر غور کرنے سے رفتہ رفتہ احساس حقیقت کا ہونا یا کائنات

افلاطون کے مطابق جہاں حقیقت اعیان کی دنیا ہے، جو مطلق، دائمی اور ناقابل تغیر ہے۔ اعیان کی دنیا کا ادراک حواس کے لئے ناممکن ہے۔ اعیان کا تصور فکر سے ہی ممکن ہے (اعیان کو دیکھا، سمجھا یا پرکھا نہیں جا سکتا ہے، اسے صرف سوچا جا سکتا ہے) اعیان کی دنیا اور عالم تغیر میں تضاد کی نسبت ہے۔ متغیر عالم کا حقیقی وجود نہیں ہے۔ یہ صرف دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا عالم تغیر طلسم نظر ہے۔ افلاطون اسی غیر متغیر حقیقت کی مزید تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اعیان یا تصورات کی دائمی اور ناقابل تغیر دنیا وہی خیالات کے غیر مختتم نقوش کی دنیا ہے اور یہی عالم اعیان حقیقی تجربہ و مشاہدہ کی چیزیں بھی ہیں۔

کائنات (Dynamic life of universe) کا حرکی وجود کی متناہیت اور اس کے اندر وسعت پذیری کی صلاحیت یہ وہ قرآنی تعلیمات ہیں۔ جن کے پیش نظر مسلم مفکرین فلاسفۂ یونان سے اختلاف کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالانکہ شروع میں مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کیا تھا۔

روح قرآن لازمی طور پہ کلاسیکی نظریات کے منافی ہے۔ کیونکہ قرآن صرف باطنی مشاہدہ کو علم کا ماخذ قرار نہیں دیتا۔ بلکہ ظواہر اور تاریخ عالم کے مطالعہ کی طرف بھی توجہ مبذول کراتا ہے۔ ایشیاء کی ثقافت کے ناکام ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہاں حقیقت کا رخ صرف باطن ہی کے راستے سے کیا گیا۔ اس عمل سے نظریات تو پیدا ہوئے مگر قوت حاصل نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ محض نظریات پر کسی دیرپا تہذیب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اس کے برعکس قرآن کی رو سے انسان کی روحانی زندگی میں اختباری رجحان (جانچ پڑتال کی طرف میلان) کا ہونا لابدی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی مشاہدہ کے ہر ایک نکتہ سے حقیقت ازلی کی معرفت ممکن ہے[۱]۔ کیونکہ حقیقت ازلی

---

[۱] دیکھو افلاطون کا نظریۂ اعیان۔ افلاطون کے مطابق انسانی مشاہدہ تذبذب اور تشکیک کو فروغ دیتا ہے۔ کیونکہ منفرد اشیا (انسانی مشاہدہ کے متناہی مراکز) متبدل صورت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہی شاہد قطعی علم (حقیقت ازلی کی معرفت کی طرف) رہبری کرتا ہے۔ اقبال نے یہ ساری باتیں:—— (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

ظاہر اور باطن دونوں میں پرتو افگن ہے[1] حقیقت کے مکمل مشاہدہ کے لئے ادراک بالحواس کے ساتھ ادراک بالقلب کی شمولیت ضروری ہے (ملاحظہ ہو اقبال کا فلسفۂ علم و عشق)۔

اقبال حقیقی اور عینی میں تضاد نہیں پاتے عینی (Ideal) کی زندگی حقیقی (Real) سے بالکل علیحدگی نہیں ہے۔ کیونکہ ویسی صورت میں حیات کی نامی کلیت افسوس ناک تضاد میں بکھر جائےگی۔ اصلیت یہ ہے کہ عینی کی متواتر یہ کوشش ہے کہ حقیقی کو سمجھ لے تاکہ وہ اپنے کل وجود کو انوار حقیقت سے مستنیر کر سکے۔

حقیقت کا حرکی مزاج ہونا اور اس کا محسوس اور متناہی کردار یہ وہ اوصاف ہیں، جو اسلامی ثقافت میں جلوہ گر ہیں۔

چونکہ حقیقت محسوس اور متناہی ہے، خودی کا تصور اقبال کے فلسفہ میں سب سے اہم مقام رکھتا ہے۔ خودی کا اظہار دے کارت اور نیٹشے کے یہاں موجود ہے (دے کارت اور نیٹشے کے تصور کے لئے

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) قرآن کریم کے ارشادات سے اخذ کی ہیں۔

[1] میکش اکبرآبادی کو وحدت الوجود (یا فلسفۂ ہمہ اوست) کی تشریح اور اقبال کے نظریہ سے اس نظریہ کا رابطہ ثابت کرتے وقت اس بات کو بغور سمجھ لینا چاہیئے تھا۔ خام مواد کو بغیر پرکھے ہوئے پیش کرنے کا عام طور پر وہی نتیجہ ہوتا ہے، جو نقد اقبال کا ہوا۔

اس مضمون کے آخر میں ضمیمہ دیکھیں) انسان کا اخلاقی اور مذہبی مقصود انکار خودی نہیں، اثبات خودی ہے۔ جو آدمی جس قدر منفرد اور نادر ہونے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا، وہ اسی قدر اس مقصد تک رسائی حاصل کرے گا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا ہے " تخلقوا باخلاق اللہ :۔ (اپنے آپ میں اوصاف خداوندی پیدا کرو) انسان جب زیادہ سے زیادہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ وہ نادر ترین ذات وحدت کے مماثل بنے، تو وہ ندرت کو حاصل کرلے گا۔ دراصل جملہ حیات انفرادی ہے۔ عالمی حیات کا وجود نہیں ہے :

پیکر ہستی ز اسرار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است

(زندگی کا پیکر خودی کے رازوں سے بنا ہے۔ پس جو کچھ تم دیکھتے ہو خودی کے اسرار ہیں)

چوں حیات عالم از زور خودی ست
پس بقدر استواری زندگی ست

(جب حیات عالم زور خودی سے ہے، تو قوت واستحکام کے اندازے سے ہی زندگی ہے)

چوں زمیں برہستی خود محکم است
ماہ پابند طواف پیہم است

(جب زمین اپنی ہستی پر مضبوطی سے قائم ہے، تو چاند برابر اس کا طواف کرنے کا پابند ہے)

ہر ذی حیات کے پاس ایک 'انا' ہے، جو اپنے اظہار کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں: ؎

منکرِ حق نزدِ مُلا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

(خدا کے وجود کا انکار کرنے والا مُلا کی نظر میں کافر ہے۔ خودی کا انکار کرنے والا میری نظر میں کافر سے بدتر ہے)۔

اسلامی تعلیم میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے:۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کی معرفت حاصل کر لی، اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ دوسروں کے گرد طواف کرنے کے بجائے اپنے گرد طواف کیا جائے۔ انکارِ خودی کا تصوّر مغلوب قوموں کی ایجاد ہے۔ جس سے ان کا منشا غالب قوموں کو کمزور کرنا تھا۔ انہوں نے اپنے پُر فریب تصوّر کا نام "اخلاقی ثقافت" رکھا۔ آدمی کا مرکزِ حیات خودی یا اَنا ہے۔ شخصیت ایک کشمکش کی کیفیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے وہی ہمارے اخلاقی پستی کی بھی خواہش کر سکتی ہے۔ اس طرح شخصیت کا تصوّر اخلاقی قدروں کا معیار بھی متعین کرتا ہے۔ اس سے خیر و شر کا مسئلہ طے ہو جاتا ہے۔ جو شخصیت کو مضبوط کرے اور محفوظ رکھے

وہ خیر ہے اور جو ضعیف کر دے، وہ شر ہے۔ فن ہو یا مذہب انسان کا ہر عمل شخصیت کے ترازو پر تولا جائے گا۔ شخصیت ہی ہر شے کا پیمانہ ہے۔ قدروں کی قدر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خارجی میزان نہیں ہے۔

خودی کو آرزوؤں کے فنا کر دینے سے قوت نہیں ملتی بلکہ دل میں تمنّا کو بیدار رکھنے سے۔ حیات مخفی طور پر تلاش میں ہے جس کا اولیں حصّہ آرزو کی تہہ میں چھپا ہوا ہے۔ خودی کی تربیت کے لئے احساس، تمنّا اور عمل کے تثلیث کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ عشق کے عنصر کی ضرورت ہے۔ عشق جذب و یکجائی آرزو کا نام ہے۔ منزل عشق تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوئی ہے۔ عشق کی غایت وہ مرد کامل ہے، جو ہماری زندگی کو بہتر شکل میں تبدیل کر سکے۔ مسلمانوں کی نظر میں ایسے مرد کامل کا پیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں ملتا ہے: ؎

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست

(آپ نسخۂ کونین کے دیباچہ ہیں۔ ساری دنیا آپ کے بندوں کی دنیا ہے اور آپؐ کی ذات آقا کی ذات ہے) ؎

از محبت چون خودی محکم شود
قوتش فرماں دہ عالم شود

(اگر محبت سے خودی محکم ہو جاتی ہے، تو اس کی قوت عالم کو تابع بنا لیتی ہے اور اپنا حکم جاری کرتی ہے)۔

خودی کی مکمل تربیت کے لئے ایک اور چیز ضروری ہے اور وہ ہے قلب کا ذات باری تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا۔ (یہ ایک ایسی بات ہے، جو ملحد نیٹشے سوچ ہی نہیں سکتا تھا) خودی اور صوفیانہ مشاہدہ کی بنیاد ایمان ہے نہ کہ استدلال۔ سائنسی تجربہ سے ہی علم اشیاء حاصل نہیں ہوتا۔ آج کے مغربی ثقافت میں اول و اقدم طور پر جو چیز حاوی ہے وہ ہے استدلال لیکن دراصل ایمان یا وجدان کی شمولیت بھی لازم ہے۔ آج انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ (۱) کائنات کا غیر مادی مطالعہ (۲) فرد کی روحانی نجات (۳) عالمگیر اہمیت کے وہ بنیادی اصول جو انسانی معاشرہ کو روحانی بنیاد پر ارتقا پذیر ہونے میں معاون ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ یورپ نے انہیں خطوط پر عینیت پسندانہ (Idealism) نظام کی تعمیر کی ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ خالص استدلال سے جو حقائق منکشف ہوئے وہ سوز یقین والی تپش پیدا کرنے کی قطعی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ بات صرف انکشاف خودی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ خالص معقولیت موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ مذہب ہمیشہ افراد کی زندگی میں داخل ہو کر معاشروں کو بدلتا رہا ہے۔ مغربی ثقافت ظاہر داری اور پیچیدگی کا مجموعہ ہے اور سب سے

بڑھ کر اس کی روح منافیٔ مذہب ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج یورپ انسان کی اخلاقی ترقی کی راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ مذہب کا یہ مفہوم نہیں کہ خودی کو خدا میں جذب کر دیا جائے جیسا کہ فلسفۂ ویدانت اور صوفیت کی تعلیمات میں ہے۔ بلکہ خودی کا تحفظ اولین مقصود ہے۔ انسان نہ صرف عالم مادیت کو تسخیر کے ذریعہ جذب کرتا ہے۔ بلکہ صفات الٰہی کو اپنے اندر جمع کر کے خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے: ؎

اند کی اندر حرائے دل نشیں
ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

تھوڑی سی دیر کے لئے اپنے دل کے حرا میں قیام کر۔ خودی کو ترک کر کے حق کی طرف ہجرت اختیار کر۔

محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سر شکن

(حق کی قوت سے مستحکم ہو کر خودی کی راہ اختیار کرو۔ ہوس کے اصنام کا سر توڑ دو)۔

جیسا کہ کہا جا چکا اقبالؔ کا عقیدہ ہے کہ آرزو، عشق اور ایمان خودی کو محکم اور محفوظ کرتے ہیں۔ ان کے برخلاف سوال (گدائی کے لئے ہاتھ پھیلانا) اس کو ضعیف کر دیتا ہے: ؎

از خم ہستی مئے گلفام گیر ✤ نقد خود از کیسۂ ایام گیر

(مئے گلفام کو ہستی کے مٹکے سے حاصل کرو۔ اپنا نقد زمانہ کے بٹوے سے لے لو)

وائے بر منت پذیر خوان غیر
گردنش خم گشتہ ز احسان غیر

(افسوس ہے اس شخص پر جو غیر کے دسترخوان کا احسان مند ہوتا ہے۔ اس کی گردن غیر کے احسان سے جُھک جاتی ہے)۔

اقبالؔ مذہب سے مذہب، معتقدات، پیر پرستی یا مذہب رسمیات مراد نہیں لیتے۔ عہد حاضر کو قوت نمو کے تجدید کی ضرورت ہے۔ طرف اعلیٰ مذہب ہی موجودہ عہد کے انسان کے ایمانی میلانات کو از سرِ نو زندہ کر سکتا ہے۔ مذہب وہی مذہب ہے جو شخصیت کے مقام کو حاصل کرنے اور خودی کے تحفظ و بقا کا اہل بننے کے لئے ضابطۂ حیات متعین کر سکتا ہو۔

مذہب تین مدارج سے گذر چکا ہے: (۱) عہد ایمانی جبکہ غیر مشروط طور پر احکام کے مفہوم و مقاصد کو بغیر سمجھے ہوئے اعتقاد رکھنا پڑتا ہے۔ (۲) عہد فکری یا مابعد الطبیعاتی بنیادوں کی تلاش کا عہد جبکہ تعلیمات دینی کا مفہوم اور ماخذ مبہم نہیں رہا (۳) عہد انکشاف اس عہد میں فلسفہ، مابعد الطبیعات کی جگہ نفسیات نے لے لی۔ اب مذہبی زندگی حقیقت مطلقہ سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا حوصلہ رکھنے لگی۔ اس صورت میں مذہب نام ہوا۔ حیات اور قوت کو ذاتی طور

پر مجتمع کرنے کے کام کا۔ اب فرد کو آزاد شخصیت مل گئی۔ اس طرح پر نہیں کہ اس نے اپنے کو قانون کے شکنجہ سے رہا کر لیا۔ بلکہ اس نے اپنے ضمیر کی گہرائی میں حقیقی منبع کو دریافت کر لیا۔

انسانیت کی نابالغی کے عہد میں توانائی وجدان نفسی (Psychic energy) ترقی کرتی تھی۔ جس سے فرد کے فکر اور انتخاب کو بنا بنایا فیصلہ مل جاتا تھا۔ انتخاب اور طریقۂ عمل کے بارے میں جیسے جیسے استدلال اور تنقیدی صلاحیت بڑھتی گئی (اور یہ حیات کے مفاد کے مطابق ہے) ویسے ویسے توانائی وجدان کے شعور کی تعمیر رک گئی۔ کیونکہ یہ غیر عقلی شعور کے راستہ سے ہو کر اس وقت آئی تھی۔ جب انسانی ارتقا اپنے اولین زینہ پر تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام قدیم اور جدید عہد کے درمیان ہے جہاں تک الہام کے ماخذ کا تعلق ہے۔ آپ کا رابطہ عہد قدیم سے ہے اور جہاں تک نفس الہام کا تعلق ہے آپ عہد حاضر سے وابستہ ہیں۔

دراصل اسلام کی بعثت کے ساتھ ساتھ استقرائی ذہن کی پیدائش بھی ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کامل و مکمل تھے بحیثیت نبی کے اور یہی آپ کا کامل و مکمل ہونا۔ بحیثیت نبی کے آپ کے بعد نبوت و رسالت کے ادارہ کے بند ہو جانے کا متقاضی ہوا۔ اسلام میں ختم رسالت کا تصور اپنی ندرت میں آپ ہے۔ اس تصور کی اہمیت یہ ہے کہ اس بنا پر صوفیانہ مشاہدہ کے متعلق

آزادانہ تنقیدی رجحان پیدا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہی اسلام میں رجائیت کے فروغ کا سبب ہے۔

بعض ناقدین کی رائے ہے کہ اقبال نے انسانیت کے بلوغ وعدم بلوغ کی ترتیب قائم کر کے اپنے لئے دشواری پیدا کر لی ہے ویسی صورت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب پیغمبرانہ شعور انسانیت کی نابالغی کے لئے ہی ضروری ہے۔ تو پھر بلوغ انسانیت کے بعد پیغمبر کے احکام کی پابندی لازم نہیں آنی چاہیئے اور یہ بات اقبال کے موقف کے خلاف ہے

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال جیسا کہ خود ان کی تحریر سے پتہ چلتا ہے۔ نظریہ ارتقا سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ وہ اجتہاد کو بھی ارتقائے انسانیت کے لئے سازگار بتاتے ہیں۔ علامہ ابن سیلویہ مولانا روم وغیرہ کی تصنیفات سے ارتقا کے تصور کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اسے اسلامی تعلیمات کے موافق قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس بات کو بھی واضح کرتے ہیں کہ میرا موضوع یہ نہیں کہ میں یہ جتاؤں کہ اسلامی تعلیم میں ارتقا کا کیا مقام ہے۔ پھر بھی ارتقا کا تصور ان کے تحت شعور پر حاوی ہے۔ انسانیت کے بلوغ اور عدم بلوغ کے مدارج اور تاریخی پس منظر سے یہ بات صاف طور پر جھلک جاتی ہے کہ شاعر مشرق جو بیک وقت مفکر اسلام بھی ہیں ارتقا میں کے انداز پر تاریخی ترتیب میں ہی مذہبی تعلیمات و تلقینات کے مختلف مدارج

قائم کرتے ہیں۔

یہاں پر ایک بات اور پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اقبال بحیثیت مفکر اور بحیثیت شاعر دو شخصیتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شاعری میں وہ علمیت اور معقولیت کو ظن و تخمین قرار دیتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ محض معقولیت نہ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں معاون ہوتی ہے اور نہ انسان پر اس کا حقیقی رتبہ ہی ظاہر کرتی ہے۔ یہ پیچیدگیوں میں گم ہو جاتی ہے اور جس قدر گتھیوں کو سلجھانا چاہتی ہے۔ اسی قدر الجھتی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف الہامی واقفیت جسے وہ عشق سے تعبیر کرتے ہیں قطعی علم کا درجہ رکھتی ہے۔ دراصل مذہبی علم اور صوفیانہ مشاہدہ کے عین مطابق یہ موقف قرار پاتا ہے۔ لیکن تشکیل جدید الہٰیات اسلامیہ میں بالخصوص جتنا زورِ قلم معقولیت پر صرف کیا گیا ہے اور الہامی تعلیمات کو تابع عقل و خرد قرار دیا گیا ہے۔ وہ تعجب خیز ہے۔

میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ انسانی عقل و فراست کو ہمیشہ وجدانی یا الہامی تلقینات کی ضرورت ہے۔ عقل کی طفلانہ مزاجی جیسی کہ پہلے تھی، ویسی آج بھی ہے۔ آج بھی مصلحت اندیشی ہلاکت کی طرف رہبری کرتی ہے اور آج بھی الہامی تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر سرخروئی اور کامیابی کی زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ دراصل نبوت کے تکمیل و اتمام کا سبب انسانی عقل و فراست کا بالغانہ شعور نہیں

ہے۔ بلکہ یہ "اِنَّا لہٗ لحافظون (بیشک ہم ان الہامی تعلیمات کی حفاظت کرتے رہیں گے)" کے تابع ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر الہامی تعلیم اسلامی تعلیم سے پہلے تحریف و تصریف سے متاثر ہو کر تابع فرمان عقل ہو گئی۔ یہ اسلامی تعلیم کا ہی طرۂ امتیاز ہے کہ یہ محفوظ ہے اور اصلی رنگ و روپ کے ساتھ آج بھی ہے۔ مزید برآں اسلامی تعلیم میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسلام ملت ابراہیمی کی ہی صاف اور ستھری شکل کا دوسرا نام ہے۔ ملت موسوی، عیسوی وغیرہ بھی تو ملت ابراہیمی کو ہی حقیقی شکل میں اجاگر کرنے کا عمل تھا۔ دراصل عقلیت کی آلودگیوں نے ہمیشہ دین فطرت کی شکست و ریخت کر کے ایک نیا ڈھانچہ گڑھ دیا ہے۔ خود اسلامی معاشرہ میں بھی بدعتوں کی شمولیت دراصل عقلیت کے الہامی تعلیمات پر غالب آنے کی کوشش ہی تو ہے۔

بہر حال علامہ اقبال کا تفقہ فی الدین قابل تحدی نہیں۔ ان کی دور رس نگاہوں کے سامنے تمام مطالب دینی واضح تھے۔ یہ امنصب یہ نہیں کہ میں ان کی باتوں پر اصلاح دوں یا خامیوں کی طرف انگشت نمائی کروں۔ یہ چند باتیں ضمناً مذکور ہو گئیں۔

زمان کے متعلق علامہ ارشاد فرماتے ہیں، خودی کی ذات میں صفت تغیر کا وجود ہی زماں کی فطرت پر غور کرنے کے لئے آمادہ کرتا ہے

ہم زماں کو مکانی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یعنی اسے باسلسلہ مانتے ہیں یا ایک ایسی خط مستقیم، جو تین حصوں (ماضی۔ حال اور مستقبل) میں قابل تقسیم ہے۔ ایسی صورت میں زمان کا تصور بحیثیت زندہ تخلیقی تحریک کے باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک سکونیٔ مطلق کا تصور رہ جاتا ہے۔ جو پورے طور پر صورت پذیر کوئی حادثات کے با ترتیب مضاعف کو رکھتا اور باسلسلہ منکشف کرتا جاتا ہے۔ ٹھیک جس طرح تماشہ بینوں پر فلم کی تصاویر منکشف ہوتی جاتی ہیں۔ اقبال اور میگ ٹگرات اس بات پر متفق ہیں کہ زمان حقیقت کا ضروری عنصر ہے۔ زمان حقیقی وہ باسلسلہ وقت نہیں ہے۔ جس کے لئے ماضی و حال اور مستقبل کی تخصیص ضروری ہے۔ یہ برگساں کے لفظوں میں خالص استدام (Pure Duration) ہے۔ جسے فکر نے منقسم کر دیا ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے، جس کے ذریعہ حقیقت اپنے دائمی تخلیقی عمل کو مقدار کے ترازو پر پیش کرتی ہے۔ لہٰذا زمان مکانی ایک قفس ہے۔ جسے حیات نے اپنے لئے ہی بنایا ہے۔ تاکہ موجودہ ماحول کو اس میں مجتمع کر سکے۔ حقیقت یہی ہے کہ ہم لازماں ہیں اور ہمارے لازمانی ہونے کا احساس ہمیں اسی زندگی میں ممکن ہے۔ بشرطیکہ اس کے حصول کے لئے ہم جاں فشانی کریں۔ اس کا انحصار ہمارے اس زندگی سے توافق کرنے انداز فکر اور اعمال پر ہے۔ جو کشمکش کی کیفیت کو برقرار رکھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ " کافر اپنے آپ کو

وقت کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کو اپنا مالک سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ اسے اس سے بلند ہو کر اس کو مسخر کر لینا چاہیئے۔ تاکہ اپنے آپ کو غیر فانی میں تبدیل کر سکے"۔ اسی طرح غلام بھی زندانی زمان و مکان ہے۔ حُر وہی ہے۔ جو تقیدات زمانی سے بے نیاز ہو:۔

ے
عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لب او حرف تقدیر است و بس
ہمت حر با قضا گردد مشیر
حادثات از دست او صورت پذیر

غلام کے لیۓ ایام کی زنجیر ہے۔ جس میں زمانہ اس کو جکڑ لیتا ہے اس کے لب پر تقدیر کا حرف ہے اور بس۔ لیکن آزاد کی ہمّت قضا کے ساتھ مشورہ کرتی ہے اور حادثات کونی اس کے ہاتھوں صورت پذیر ہوتے ہیں۔

چند مفکّرین یورپ جن کا ذکر اقبال کے ساتھ اکثر آتا ہے

آرتھر شوپنہار (Arthur Schofenhauer)

۱۷۸۸ - ۱۸۶۰ء - کا نظریۂ ارادہ:۔

انسان کی فطرت میں جو داخلی جوہر ہے۔ اس کا نام ارادہ ہے۔ انسان کے اعضاء کی حقیقت ارادہ سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ

مختلف اعضاء سے مختلف تمنیات کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً دانت، حلق، اور آنت بھوک کی مرئی شکلیں ہیں۔ دماغ ارادۂ علم کی ظاہری صورت ہے اور قدم ارادۂ رفتار کی۔ مگر محض اسی اولین عمل (کھانا، سیکھنا، چلنا) کا ثانوی نتیجہ ہے۔ ہم عمل کرنے کے لئے سوچتے ہیں۔ لیکن تحریک عمل پر آمادگی کسی مقصد معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ یہی عمل کی لازمی بنیاد بھی ہے۔ جب مقصد کا علم حاصل ہو جاتا ہے، تو ظاہری دنیا میں اسی علم کی بدولت بیشمار انوار کا انعکاس ہوتا ہے۔ کائنات میں ہر جگہ دائمی کوشش اور توانائی بخش طاقت کارفرما ہے۔ چاہے وہ حیوانات کا وجدان ہو، یا نباتات کا اصول حیات یا چاہے غیر نامی مادوں کی بے بصر قوت ہی کیوں نہ ہو۔ ہر جگہ ارادہ ہی کی نمود ہے۔ غرض ارادہ تمام تر وجود کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ہم اس محکم، مستقل اور غیر مختتم جذبۂ تحریک عمل پر غور کریں۔ جس کی وجہ سے پانی سمندر کی طرف دوڑتا ہے، مقناطیس کی ہر گھڑی یہ کوشش کہ وہ اپنا رخ قطب شمال کی طرف پھیر دے یا لوہے کی مستعدی کہ مقناطیس تک پہنچ جائے، تو ہم دیکھیں گے کہ یہ سب بھی انسانی تمناؤں کی طرح ہی رکاوٹوں کے حائل ہونے پر اور زیادہ قوت پیدا کر لیتی ہیں۔ وہی چیز جو ہم میں ہے اور علم کی روشنی میں اپنے مقصد کا قصد کرتی ہے ضعیف ترین نمود کی صورت میں بغیر کسی مزاحم کی خلل اندازی کے اندھی اور گونگی حالت میں

اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ دونوں حالتوں میں وہ ارادہ کے نام سے ہی موسوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر جگہ وہ ایک جیسی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ صبح کی ہلکی شعاع اور تپتے ہوئے دوپہر کی تیز شعاع دونوں سورج کی کرنیں ہی کہلاتی ہیں۔

حقیقت ارادہ ہے۔ ارادہ واحد اور غیر منقسم ہے۔ بظاہر جو بھی متضاعف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ دراصل انسانی فکر کی داخلی ترکیب کی وجہ سے ہیں۔ یہی داخلی ہیئت ہمارے اور صداقت کے درمیان حائل رہتی ہے۔ اس داخلی ترکیب کا نام زمان اور مکان ہے۔ جس طرح طلسمی چراغ سے بہتیری مختلف تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تمام تصویریں ایک ہی روشنی کے عکس سے دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے ہی کائنات کے اندر جتنے گوناگوں مظاہر ہیں، جو چاہے بیک وقت عالم ظہور میں آئے ہوں۔ یا بطور واقعات کے پے بہ پے بالترتیب رونما ہوتے ہوں، سب گویا ایک ارادہ کی نمود ہیں۔ اسی کے تمام مظاہر ہیں۔ اسی کی تمام ظاہری صورتیں ہیں باوجودیکہ ہر گھڑی انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ وہ تمام تغیرات کے بیچ جوں کا توں رہتا ہے۔ اب اس صورت میں ہمیں اپنے عالمی ارادہ کے تصور سے ذہنی مقاصد کے عمل کو جو مخصوص طور پر انسانی ارادہ ہے۔ الگ کر دینا ہوگا۔ ذہانت تو صرف سطحی مظہر ہے۔ یعنی یہ ایک قالب ہے۔ جسے وجود اس لئے اختیار کرتا ہے تاکہ وہ اپنی نا آسودہ

کوششوں کو حاصل کر سکے۔ لیکن یہ قالب وجود کی اصل فطرت میں نہیں ہے۔ ارادہ میں اپنے تئیں عقل و بصارت کی صفت نہیں۔ سامنے پست موجودات کے اندر یہ علم سے محروم رہتا ہے۔ مثلاً چڑیوں کے گھونسلے اور مکڑیوں کے جالے، فراست کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ایسے وجدان کا نتیجہ ہیں، جو دور بینیٔ عقل و خرد سے بے نیاز ہے۔ جیوں ہی ارادہ کی نمود زیادہ پیچیدگیوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہ اپنے لئے ذہانت کے چراغ روشن کر لیتی ہے۔ تاکہ پیچیدگیوں کی ظلمتوں میں رہنمائی حاصل کر سکے۔ پس ارادہ ذہانت سے کہیں زیادہ توانا جڑوں کے ساتھ قائم ہے۔ ارادہ اور ذہانت کے اتصال کی مثال ٹھیک اس اندھے کی ہے، جو ایسے لنگڑے کو کاندھے پر لے کر چل رہا ہے، جو راستہ کو دیکھ سکتا ہے۔

فریڈرک نیٹشے (Friedrich Nietsche) اور تصوّر فوق البشر:۔

نیٹشے کے فلسفیانہ تصورات کا پس منظر شوپنہار کا ارادہ ہی ہے لیکن نیٹشے کے یہاں وہی تصور ارادہ کچھ بلندی اور وسعت اختیار کر گیا ہے۔ حقیقت کا جوہر قوت ہے۔ جس کا اظہار ارادۂ حیات میں نہیں ہوتا۔ بلکہ تمنائے قدرت و اختیار میں ہوتا ہے۔ نیٹشے کا یہ مخصوص تصوّر (مثبت طور پر) فن کے اس نوابی تصوّر سے ہم آہنگ ہے۔

جس کی رو سے وہی پیکر حسین ہے۔ جو عظیم ترین حیاتی قوت کے قالب میں ڈھالا گیا ہو۔ یونانی حسن کے جمال و جلال کا تصور ہیلن کے مثالی پیکر میں نمایاں تھا۔ نیٹشے کے مطابق وہ نقش جمیل یونانیوں کے اخلاقیات کی وجہ سے بگڑ گیا۔ بہر حال نیٹشے زیادہ تر اس بات پر زور دیتا ہے کہ وہ خام تصورات کو نکال پھینکے۔ منجملہ ان چیزوں کے جنہیں وہ خام قرار دیتا ہے۔ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق متوسط درجہ کے آدمیوں سے ہے۔ خصوصی طور پر اخلاقیات' مذہب' ترقی اور صداقت تمنائے قدرت و اختیار کے لئے رکاوٹ ہیں۔ ان سے نجات پائے بغیر قوت کا جوہر انسانی قالب نہیں اختیار کر سکتا۔

نیٹشے ریاست کے معاملہ میں ہر اس طرز حکومت کی مذمت کرتا ہے جو انسانی اور مساویانہ اقدار کا دم بھرتی ہے۔ مثلاً جمہوریت اشتمالیت وغیرہ۔ ایک ایسی مطلق العنانی حکومت جس کی باگ ڈور ایک زبردست ہاتھ میں ہو۔ نیٹشے کی پسند کے مطابق ایک قابل قدر ریاست ہے۔ کیونکہ ایسا مطلق العنان حکمراں دلیری کا مادہ رکھے گا وہ قدرت و اختیار کا برابر قصد کرے گا اور ان قدرتوں کی توسیع چاہے گا۔ جمہوریت اور اشتمالیت کے اندر آزادی' مساوات اور انصاف کی بات اس لئے کی جاتی ہے کہ یہ وہ ہتھکنڈے ہیں جن سے کمزور' بزدلانہ مگر عیارانہ رویہ سے اپنے آقاؤں پر گرفت

لگا دیتا ہے۔ ایسی ریاستیں انسان کو غلام بنا کر مویشیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ پست خیالی کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔ ان کے بھلڑے مقاصد میں امن، قناعت اور تحفظ ہیں۔ جبکہ یہ ہر طرح کے مستثنیات مثلاً قوت و جبروت (ہر وہ چیز جس سے انسان عظیم ہوتا ہے) کی دشمن ہیں۔ جنگ نہ کہ امن۔ جوانمردی کی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ "تم کہتے ہو کہ ایک بہتر سبب جنگ کو بھی متبرک بنا دیتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایک بہتر جنگ ہر طرح کے اسباب کو متبرک بنا دیتی ہے۔" حیات چشمۂ مسرت ہے۔ مگر اس کا پانی اگر پست لوگ بھی پینے لگیں، تو سارا چشمہ زہر آلود ہو جاتا ہے۔

علم اور صداقت کو جاننے کی ہر کوشش ناقابل احترام ہے سائنس داں ایک مریض انسان ہے جو اپنی مخصوص دلچسپی کے منہمک میں رہتے ہوئے سارے عالم سے آنکھیں موند لیتا ہے۔ وہ اپنے عمل کے لئے امن اور سکوت کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ بے حوصلہ رجائیت پسند ہے۔ جو سائنس کا اثبات اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنی تعمیرات کی وسعتوں سے کروڑوں کے لئے آرام کا سامان فراہم کرتا ہے۔ دراصل صداقت نام کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ صداقت ایک ایسے قسم کی غلطی ہے۔ جس کے بغیر بعض مخصوص ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمارے سارے تصورات مکان، زمان اور اسباب و علل ان میں سے ہر ایک عملی حربہ ہے۔ جو ہر دوسری چیز کی طرح

اس وجہ سے قائم ہے کہ یہ ایک مخصوص حالت میں انواع کی بقا کے لئے مفید ثابت ہوا ہے۔ ان کی ان انواع کے مقابلہ میں جو ان کا استعمال کرتی ہیں کوئی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اگر حالات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے، تو ہمیں خیالات کی تبدیلی کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔

اب ان اخلاقی صداقتوں یا میزانوں کا معاملہ ہے۔ جن کا انحصار ضمیر پہ ہے۔ نیٹشے اس موضوع پر بہت زیادہ زور دیتا ہے آدمی کی وہ نئی نسل جس کے لئے نیٹشے راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے اس کا واقعتہً اپنا اخلاقی نظریہ ہوگا۔ لیکن وہ مسلمہ اقدار کو پلیٹ کر رکھ دے گا۔ اس کا اخلاق بلند تر اخلاق ہوگا۔ اس میں حیات کی بے پناہ صلاحیت ہوگی۔ اس کی انانیت رحم وحلم سے مبرا ہوگی صاحب اخلاق حمیدہ دلیر، قوی، ہمت ور اور جری ہوگا۔ اس کا مقصد ہوگا جذبات پر قابو پانا۔ لیکن ان کو ختم یا ضعیف نہیں کرنا عظیم شخص عظیم ہوگا، نہ اس لئے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے راستہ نکال لے گا۔ اس کی عظمت کا اظہار اس میں ہوگا کہ وہ اپنی عظیم تر قوت سے جانور نما انسانوں کو اپنا پابند رکھے گا اور انہیں اپنی خدمت پر مامور کرے گا۔ اس کے حق میں قناعت نہیں مزید قوت کی طلب ہوگی۔ امن کی بجائے جنگ اور کار ثواب کی جگہ صلاحیت کی خواہش کرے گا۔

لوگ جس چیز کو خیر کہتے ہیں وہی شر ہے۔ ضعیفوں کا اخلاق غلامانہ

اخلاق ہے۔ یہ زوال و پستی کی پیداوار ہے۔ یہ حیاتی قوت کو مضمحل کر دینے کی تلقین ہے۔ خوف و ہراس کے مقابل اس کے اصول وضع ہوئے ہیں۔ ہر وہ شئے جو فرد کو جانور کے درجہ سے بلند کرتی ہے وہی اپنے ہمسایہ کے لئے خوف کا ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے ایسی چیزوں کو شر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح تمناؤں کے معاملہ میں پست خیلی سے کام لینے پر امتیازی اخلاق کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اچھا اسی کو کہتے ہیں، جو پست خیال، ناسمجھ اور کم شعور ہو۔ ایسے خیر جیسے عصمت، جفاکشی، فیاضی، عاجزی وغیرہ کی بڑی تعریف ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ وہ نذریں ہیں، جو کسی کے دلیرانہ مقصد، یا باعزت وجود کی راہ میں حائل ہیں۔ صاحب اخلاق اسی کو کہتے ہیں۔ جس کی نظر میں انانیت، بلند حوصلگی اور حسن بُری چیزیں ہوں۔ مذہب کی آڑ میں بہیترے ایسے بڑے بڑے اوزار بنائے گئے ہیں جن کے ذریعے بلند تر فطرت رکھنے والے کو قید کیا جا سکے۔ وہ جن کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ وہ بلند فطرت افراد کی برابری میں نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے وہ ان سے رقابت رکھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں نیٹشے کو عیسائی اخلاقیات سے سخت نفرت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایسی نامردی کہ ضعف کی وجہ سے کچھ کرنے کی صلاحیت باقی نہ ہو، عیسائیت میں اچھائی شمار کی جاتی ہے۔ اس مذہب کے اصول بزدل کی پست حوصلگی کو عجز، اور نفرت کرنے والے مخالفین کے

سامنے گھٹنے ٹیک دینے کو فرماں برداری قرار دیتے ہیں۔ عیسائی جس خدا کی پرستش کرتے ہیں وہ افلاس، خاکساری، عشق، معافی اور رحم کا خدا ہے۔ اسے ہم غلام قوم کا خدا کہہ سکتے ہیں۔ کسی فاتح قوم کا خدا نہیں کہہ سکتے۔

دراصل ترس کھانا بدترین گناہ ہے۔ یہ ان سارے توانا جذبات کے مخالف ہے، جو احساس حیات کی توانائی کو بڑھاتا ہے۔ رحم سے دکھ بڑھتا ہے اور حسن پیدا نہیں ہوتا۔ رحم کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں کو زیادہ سے زیادہ دکھی بنا دیا جاتا ہے اور اس کے دکھ کو بے دوا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بیماروں اور مضمحل لوگوں کو اپنے مرض و اضمحلال کے آثار تندرستوں پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ کمزوروں کو فنا ہو جانا چاہیئے اور ان کے فنا ہونے میں ان کی مدد بھی کرنی چاہیئے۔ اس سے بلند اقوام کے مفاد برقرار رہتے ہیں۔ فنا و بقا کے لئے یہی شرط اولین قرار دینی چاہیئے۔ قوی آدمی کو ہمدردی کی مسموم ہوا سے بچنا چاہیئے۔ اس کے برخلاف ظلم، سختی اور نفرت کو ضعیف کے حق میں بڑھانا چاہیئے۔ اس کا یہ مقصود نہیں ہونا چاہیئے کہ دکھ اور تکلیف ختم ہو جائے۔ بلکہ دکھ اور تکلیف میں اضافہ کرنا اس کا مقصد ہونا چاہیئے۔ حسن کی تخلیق کے لئے دکھ زیادہ ضروری ہے۔ وہ لوگ جو اتنا قوی ہیں کہ دکھ پر حاوی ہو سکتے ہیں اور اس کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ دکھ کی

وجہ سے ان لوگوں میں زندگی سے محبت بڑھ جاتی ہے۔ جو دکھ کا چرکا لگا سکتا ہے اور اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ وہ فنی تخلیقات کی لذّتوں کو بھی چکھ سکتا ہے۔ اسی حال میں فوق البشر کی ایک دلیر اور بلند تر قوم پیدا ہو سکتی ہے۔ جب اس قوم کے اندر ارادۂ قوت مرکوز ہو، جس کے افراد اچھائی اور برائی سے بلند تر ہوں۔ حسُن کو جنم دیتے ہوں، خطرات میں زندگی گزارتے ہوں۔ موت کی بازی لگانا جانتے ہوں اور ضعیف نسلوں کو پھانسی چڑھا کر وہ بنیاد ڈال سکتے ہوں، جس پر چڑھ کر وہ بلند تر وجود کی رفعت حاصل کر سکتے ہوں۔ انسانی جدوجہد کے لئے یہی قابل قدر مقصد ہے۔

رینے ڈیکارٹ (Rene Descarte) ۱۵۹۶ء۔ ۱۶۵۰ء کا تصوّر خودی:۔

ڈیکارٹ کے فلسفہ کی بنیاد وجود خودی پر ہے۔ خودی کے وجود پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس شبہہ کے اندر بھی خودی کا اظہار قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ خودی جس کا وجود اس درجہ یقینی ہے، کیا ہے؟ ہم اس بات کے عادی ہیں کہ اپنے بارے میں اس طرح سوچیں کہ ہم جسم اور ذہن کے مجموعہ ہیں۔ جسم کے بارے میں ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ شئے ہے، جس کی ایک صورت ہے۔ یہ ایک جگہ کو گھیرتی ہے۔ تاکہ دوسرے اجسام سے اپنے کو الگ کر سکے۔ یہ

خارجی اثرات کا احساس کرتی ہے۔ لیکن یہ صفات اس خودی سے متعلق نہیں ہیں جو فکر کی ایک ضرورت ہے۔ مان لیجئے کہ کوئی کائیاں مجھے دھوکا دیتا ہے۔ ایسی صورت میں میرے جسم کے سارے صفات پر شبہہ کا اثر ہوگا۔ اگر روح کی طرف ایسی حالت میں رجوع کروں اور دریافت کروں کہ یہاں کوئی ایسی شئے ہے جو داخلی طور پر میری ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ فکر ہے۔ اس لئے جب تک ہم سوچتے ہیں ہمارا وجود ہے۔ لیکن اگر ہم سوچنا چھوڑ دیں اور چاہے ہم ابھی دیکھ ہی رہے ہوں، ہمارا وجود ختم ہو جلئے گا۔ تب صحیح طور پر ہم اپنے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک شئے ہیں، جو سوچتے ہیں، یعنی دماغ ہیں فہم یا فراست ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں، جن کی اہمیت کا راز ہم کو پہلے معلوم نہ تھا۔

درحقیقت ہم صاحب وجود شئے ہیں سوال یہ ہے کہ کون سی شئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ شئے جو سوچ سکتی ہے مگر اس کے علاوہ اور کیا ہیں؟ میں اپنے خیالات کو دوڑاتا ہوں کہ اپنے بارے میں مزید معلومات حاصل کروں، میں ان اعضاء کا مجموعہ نہیں جو انسانی جوارح و اعضاء کہے جاتے ہیں۔ میں کوئی ایسا آبجزہ نہیں، جو اعضاء و جوارح میں گھس گیا ہو۔ میں ہوا، سانس یا بھاپ بھی نہیں۔ نہ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز جس کی میں تصویر بنا سکوں،

یا خیال میں لا سکوں کیونکہ میں نے مان لیا ہے کہ میں ان ساری چیزوں میں سے کچھ نہیں ہوں (یعنی میں انسانی جوارح، بھاپ سانس نہیں ہوں، تو تصویر کس کی اُتاروں یا خیال میں کیسے لاؤں) جب تک اس مفروضہ کو بدل نہ لوں اس وقت تک میرا اس بات پر یقین ختم نہیں ہو سکتا کہ میں ایک شئے ہوں۔

پھر وہی سوال اُٹھتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ ایک شئے جو سوچ سکتی ہے، وہ شئے جو شبہ کر سکتی ہے۔ سمجھ سکتی ہے، تصوّر کر سکتی ہے، اثبات و نفی کر سکتی ہے، ارادہ کر سکتی ہے، ارادہ نہیں کر سکتی ہے، جو خیال کر سکتی ہے اور استدلال بھی کر سکتی ہے یہ یقینی ہے کہ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ یہ ساری خصوصیتیں ہماری اپنی ہیں۔ کیا میں وہ نہیں ہوں، جو اب بھی شبہ ظاہر کرتا ہوں۔ کچھ چیزوں کو سمجھتا اور ان کا ادراک کرتا ہوں۔ میں ہی ان کی صداقت کو ضابطۂ یقین و اثبات میں لاتا ہوں اور بقیہ کی نفی کرتا ہوں مزید جاننے کی خواہش اور ارادہ کرتا ہوں اور یہ کوشش کرتا ہوں کہ آئندہ دھوکہ نہ کھاؤں۔ یہ بھی یقینی ہے کہ مجھ کو خیال کی قوت ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں میں نے خیال کیا وہ حقیقتاً نہیں تھیں۔ اس کے باوجود میرے اندر سے قوتِ خیال ختم نہیں ہو سکتی۔ میں تعقل کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ یعنی بعض اشیاء کا علم رکھتا ہوں۔ جس کے لئے حواس سے میں نے کام لیا ہے۔ کیونکہ میں

روشنی کو دیکھ سکتا ہوں، ہنگامے کو سن سکتا ہوں، ہنگامے کو سن سکتا ہوں اور گرمی کو محسوس کر سکتا ہوں۔ مگر ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ظاہری صورتیں ہیں، جو باطل ہیں اور میں عالم خواب میں ہوں۔ اگر اس کو مان لیا جائے، تو بھی یہ بالکل یقینی ہے کہ مجھ پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں روشنی کو دیکھتا ہوں۔ شور و غل سنتا ہوں اور گرمی محسوس کرتا ہوں۔ یہی وہ چیز ہے، جس کو میں تعقل کہتا ہوں اور تعقل سوچنے کے علاوہ کوئی دوسری شئے نہیں ہے۔ اس نکتہ پر پہنچ کر ہم اپنے کو زیادہ واضح اور امتیازی طور پر سمجھنے لگتے ہیں۔

وہ بنیاد جس پر دے کارت اپنے فلسفہ کی عمارت تعمیر کرتا ہے وہ ہے بیداری ضمیر۔ یہ تنہا وہ شئے ہے جس پر شبہہ کرنا ناممکن ہے یہی ہے جو اس مشاہدہ سے ہم کو روشناس کرتا ہے۔ جس کی صداقت کا انحصار اخذ نتیجہ پر نہیں بلکہ مشاہدہ میں آنے والے فوری حقائق پر ہے۔ مجھے اس خارجی پیکر کے بارے میں غلطی ہو سکتی ہے جس کے بارے میں خیال آرائی کرتا ہوں۔ لیکن فکر کو ہی مشکوک قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس انا یا خودی کو جو سوچتی ہے، یہ صحیح ہے کہ میں اس بات کا عادی ہوں کہ اشیا اور اجسام کو ناقابل انکار حقیقت مان لیں۔ مثلاً جب ہم ایک موم کے ٹکڑے کو اپنے آگے دیکھتے ہیں، تو کیا ہم اس کا یقین نہیں کرتے؟ پس جب ایک موم کے ٹکڑے کی ظاہری شکل

کا اس وضاحت کے ساتھ تعقل کر سکتے ہیں، تو کیا اپنے آپ کو اس سے زیادہ یقین اور صداقت کے ساتھ نہیں جان سکتے ؟ اگر میں یہ فیصلہ کر سکتا ہوں کہ موم ہے یا موم کا وجود ہے۔ صرف اس حقیقت کی وجہ سے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں، تو اس سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ میں ہوں یا میں اپنے تئیں اپنا وجود رکھتا ہوں۔ اس کی بھی حقیقت یہی ہے کہ میں دیکھتا ہوں کیونکہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ جسے میں دیکھ رہا ہوں وہ درحقیقت موم نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے دیکھنے کے لیے آنکھ ہی نہ ہو لیکن جب تک میں دیکھتا ہوں، یا سوچتا ہوں کہ دیکھ رہا ہوں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں کوئی شے نہیں ہوں۔

دوسرا باب

خودی

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کے شعور میں ایک روشن نقطہ ہے جس کی روشنی کا اثر یہ ہے کہ انسان کے دل میں خیالات تمنائیں اور جذبات ابھرتے ہیں اور انہیں وہ صاف طریقہ پر اظہار کر دیتا ہے اس روشن نقطہ کا نام خودی یا انا یا میں ہے۔ ہم آئے دن کہتے ہیں کہ یہ کام میں نے کیا یا یہاں میں ہوں لیکن "میں" کی حقیقت ہم نہیں جانتے۔ اگرچہ اس "میں" کا عمل بالکل ظاہر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ "میں" سمجھتا ہوں "میں" دیکھتا ہوں "میں" پہچانتا ہوں لیکن ہمارے وجود کی وہ اکائی جو "میں" ہے اور اپنے اندر سمجھنے دیکھنے اور پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے دراصل یہ انسان کے وجود میں چھپ کر اپنا کام کرتی ہے۔

(۱)

خودی کی دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ نفسیاتی طور پر ہمارے ذہن کی مختلف

حالتیں ہوتی ہیں اگرچہ ہمارے ذہن کی ساری حالتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بیوہ ایک زیور کے ڈبہ کو دیکھ کر اپنے سہاگ کے دنوں کی لذت آگیں کیفیتوں میں منہمک ہو جاتی ہے اور اس کے دل میں خوشی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ پھر جب وہ ان ہاتھوں کو یاد کرتی ہے جو اس کے مرحوم شوہر کے ہاتھ تھے۔ جس نے اپنی سالگرہ کے تحفہ میں اسے وہ زیور کا ڈبہ دیا تھا تو وہ درد والم کا احساس کرتی ہے۔ اب اس پورے حادثہ پر غور کرو تو خود بخود سمجھ جاؤ گے کہ بیوہ مذکور کی ذہنی کیفیت ایک زیور کے ڈبہ کو دیکھ کر کتنی مختلف کیفیتوں سے دو چار ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے ذہن کی ساری کیفیتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کیفیت کو الگ نہیں کر سکتے۔ خودی کا اظہار تو ایسی کیفیتوں کی اکائی میں ہوتا ہے۔ مگر کیفیتیں شاخ در شاخ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی پھیلتی اور بکھرتی جاتی ہیں۔ خودی کا پھیلاؤ بھی اسی طرح بڑھتا جاتا ہے۔ اب دیکھو کہ ایک ہی کتاب پانچ بجے شام کو خدا بخش لائبریری میں بھی ہو اور تمہارے مطالعہ کے کمرے میں بھی ہو ممکن نہیں ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک ہی واقعہ دو وقتوں میں ہو۔ کیونکہ مادی چیزیں ہر وقت ایک جگہ کی پابند ہیں۔ لیکن خودی وقت اور جگہ کی پابند نہیں ہے۔ میں ایک وقت میں ایک جگہ پر موجود ہو کر دوسری اور تیسری جگہ کے تصور سے لطف

ے سکتا ہوں۔ خودی ماضی حال اور مستقبل کی بھی پابند نہیں ہے۔

(۲) خودی کی اپنی یکتائی ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ دیکھو کہ جب ہم کہتے ہیں کہ "میرے دانت میں درد ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ میں ایک ایسی تکلیف کا احساس کر رہا ہوں جس میں میرا حصہ دار کوئی نہیں ہے۔ دندان ساز میری تکلیف کو دیکھ کر مجھ سے ہمدردی کر سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میری جگہ وہ خود درد کا احساس کرنے لگے" یہ تو ایک مثال ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ احساس، تمنا، جذبہ، تجربہ، فیصلہ یہ سب کچھ جیسے بھی ہوں ہمارے ذاتی اور انفرادی احساس و تجربہ ہیں اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق ہمیشہ میری ہی ذات سے ہوگا۔ "اگر میں آپ کو پہچانتا ہوں تو اس لئے کہ میں آپ سے پہلے مل چکا ہوں"۔ اس لئے میرا پہچاننا میرے ہی پہلے والے ذات پر مبنی ہے۔

کسی چیز کو جاننا یا تجربہ کرنا انسان کے ذہن، شعور یا نفس کا کام ہے انسانی ذہن کے بیشمار تجربے کرتا ہے اور بہتری واقفیتیں حاصل کرتا ہے اس طرح ماحول سے اثر قبول کرنے یا ماحول پر اپنا اثر ڈالنے کا کام بھی ذہن کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایک ذہن بیشمار تجربے کر سکتا ہے اس کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ "میں" احساس تجربے اور ادراک کے معاملہ میں کتنا سرگرم ہوں پس خودی یا "میں" ایک رہنما قوت ہے۔ نئی تجربوں کے سلسلوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اسی کی بدولت ہم ماحول سے اثر لیتے اور اپنا اثر ماحول پر ڈالتے ہیں پھر بھی میرے تجربوں اور واقفیتوں سے مجھے نہیں جانا جا سکتا۔ خودی کا ایک مخصوص اور منفرد وجود ہے"۔ مجھے وہی جان سکتا ہے جو مجھے دیکھے گا اور میرے بارے میں

میرے طور طریقے ارادہ وغیرہ کا اندازہ لگائیے گا۔"

اب انہیں باتوں کو پھر مختصر میں دیکھو اور غور کرو:۔

خودی ایک اکائی ہے جو حقیقت کے اعتبار سے ظاہر نہیں لیکن عمل کی رو سے ظاہر ہے۔ انسان کے وجود میں یہ وہ مرکزی نقطہ ہے جو خیالات تمناؤں اور جذبات کا محرک ہے۔ یہ جوہر انفرادی ہے اور اس میں کوئی کسی کا شریک نہیں ہے۔ خودی اپنی حرکت کے لئے زمان و مکان کی پابند نہیں ہے۔ اس کی وحدت تجربوں اور مشاہدوں کی کثرت میں نمودار ہوتی ہے۔ ہر طرح کے تجربہ اور مشاہدہ کے حاصل کرنے یا ماحول پر اثر انداز ہونے یا ماحول سے اثر پذیری میں یہی خودی ہماری رہبری اور رہنمائی کرتی ہے۔

خودی تین طرح کی ہوتی ہے (۱) فرد کی خودی (۲) ملت کی خودی اور (۳) خدا کی خودی۔

(۱) فرد یا ذات واحد کی خودی زندگی کی ایسی اکائی ہے جو نہایت ہی محدود اور متناہی ہے اس وجہ سے فرد کی خودی اپنی اصلیت کے اعتبار سے بہت ہی ناقص ہے لیکن اس کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ یہ اپنے اندر اس بات کی آرزو کر سکے کہ اس کی خودی زیادہ ہمہ گیر، زیادہ موثر اور زیادہ متوازن ہو گویا اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ اس کا ظہور زیادہ یکتا اور نایاب وحدت میں ہو۔

(۲) افراد جب جماعت کے رشتہ میں جڑ جاتے ہیں تو ان کی خودی جو

ایک قطرہ کی طرح ناقص اور محدود بھی سمندر کی طرح اتھاہ اور بیکراں ہو جاتی ہے۔ جماعت کی خودی کے ساتھ ماضی اور مستقبل کا ایسا تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ وہ غیر فانی ہو جاتی ہے۔ ملت کی خودی کا نشو ونما فرد کی خودی کی طرح ہوتا ہے۔ ملت کے بڑے وجود میں فرد کا وجود اعضائے جسمانی کا وجود ہے یا یہ کہ فرد کی خودی ملت کی خودی میں ضم ہو کر اس طرح پھلتی پھولتی ہے جس طرح ایک منفرد پودا گلستاں کے رنگ برنگ کے پودوں کے بیچ۔

(۳) وہ عمیق ترین خودی جس نے اپنے حکم سے بے شمار خودی کی اکائیں کو پیدا کیا جو خود بھی سب پر حاوی ایک عظیم خودی ہے۔ عالم موجودات اسی خودی کا مظہر ہے اور جس قدر مظاہر ہیں انہیں میں خودی کا راز ہے۔

مزید تفصیل

اقبال کے نزدیک انسان کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ روح اور بدن کا مجموعہ ہے اور اس کی روحانی اور مادی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔ وہ کائنات کے اندر ایک تماشائی بھی نہیں ہے۔ جو جامد طور پر بیٹھا ہوا مظاہر عالم کی گوناگوں کیفیتوں کا نظارہ کر رہا ہے۔ انسانی وجود کا وہ نقطۂ وحدت (خودی) جو نہ صرف انسانی تمناؤں، تخیلات اور جذبات کے اظہار کے لئے مشعل ہدایت کا کام کرتا ہے۔ بلکہ امکانات انسانی کو بروئے کار لا کر تسخیر کائنات کا گر سکھاتا ہے۔

اقبال کی شاعری اور ان کے افکار و آرا میں خودی اور خودی کے عرفان کے تصور کو

مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اقبال نے بالخصوص اس پر کیوں اس قدر زور دیا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے۔ اسلام کی ابتدائی تعلیم عرفان ذات یا عرفان خودی کے تصور سے شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں واضح طور پر ارشاد ہے "وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (اور وہ تمہاری ہی ذاتوں میں ہے۔ پھر تم کیوں نہیں دیکھتے)۔ دوسرے یہ کہ تین باتیں واضح طریقہ پر انسان کی ذات کے لئے سمجھادی گئی ہیں۔ (۱) انسان ساری مخلوقات میں سب سے بہتر اور پسندیدہ مخلوق ہے (۲) وہ زمین پر خدا کا نائب ہے (۳) اس کی شخصیت آزاد ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسلامی افکار کی آمیزش یونانی اور عجمی افکار و آراء سے ہوئی تو اسلامی تعلیمات پر یونانی اور عجمی اثرات چھاتے چلے گئے۔ اس سے اسلامی انحطاط اور زوال کے سامان مہیا ہو گئے۔ یہی اثر تھا کہ کچھ بندوں علمائے اسلام نے دنیا کو بے بنیاد اور موہوم شئے قرار دینا شروع کر دیا۔ ان کی نظر میں عالم وجود ایک طلسم خیال سے زیادہ نہیں۔ یہ ویدانت کے "مایا" کے تصور سے ملتا جلتا تصور ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ صاف اور صریح طور پر قرآنی تعلیم کی مخالفت کرتا ہے۔ پھر بھی عالم اسلام میں اس تصور کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب کوئی صائب رائے انسان تخلیق کے اسرار پر صحیح طور سے غور کر لیتا ہے اور حرکت زمان کی پیہم تبدیلیوں کو سمجھ لیتا ہے تو وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ عالم کائنات غیر حقیقی اور بے بنیاد نہیں ہے وہ کہتا ہے "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۱۵ اے میرے رب تیری تخلیقات بے بنیاد اور غیر حقیقی نہیں ہیں۔

تخلیق ایک حق اور صداقت ہے۔

بہرحال کائنات کو غیر حقیقی سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر زندگی کا عملی پہلو متاثر ہو گیا اور انسان کا جذبہ عمل قطعی طور پر سرد پڑ گیا۔ بے عملی اس قدر بڑھ گئی کہ اسلامی معاشرے میں راہبوں کی طرح دنیاوی مشاغل سے الگ ہو کر اللہ ہو اللہ ہو کی مجلس جمانے کا چسکہ بڑھنے لگا۔ اقبال نے خودی یا عرفان نفس کے تصور کو بخوبی سمجھا اور اس کی غایت کو جانا۔ وہ اسی کی تبلیغ کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کو اس بات پر کامل یقین ہے کہ عرفان خودی کا جذبہ اگر ملت کی اجتماعی خودی میں داخل ہو گیا تو نشاۃ ثانیہ ممکن ہو جائے گا۔

خودی کا کام کیا ہے

انسان کی تخلیق کا راز یہی ہے کہ وہ زمین پر خدا کی نمائندگی کرے اور یہی وجہ ہے کہ اسے ساری مخلوقات سے اشرف بنایا گیا اور اس کو تصرف اور قبضہ کا اختیار بخشا گیا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ہ	اللہ تو وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا وہ ساری کی ساری چیزیں جو زمین میں ہیں۔
اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ	کیا تم سب یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے تابع کر دیا ہر وہ چیز جو آسمانوں

وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً

میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے؟ اس نے تم پر اپنی نعمتیں مکمل کر دی ہیں۔ یہ نعمتیں ظاہری اور باطنی دونوں ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان کی تخلیق اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو اسی خلافت یا نیابت کی حیثیت سے جو اسے حاصل ہے کائنات کی ہر شئے چاہے چھوٹی ہو یا بڑی اس تصرف و اختیار میں دے دی گئی ہے اسی سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سار قوتیں اور ساری ظاہری اور باطنی نعمتیں جو انسان کو حاصل ہیں وہ خدا کی بہت بڑی نوازشیں ہیں۔ انسان کو ملی ہوئی یہ ساری قوتیں اور ساری نعمتیں بخشی ہوئی (DELEGATID POWERS) ہیں اس لئے ان کا شکر ادا کرنا لازمی ہے اور ادائے شکر کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ انسان ان بخششوں کا صحیح اندازہ لگائے۔ یہ بخشیں اپنی وسعتوں اور نہایتوں کے اعتبار سے بے شمار ہیں جب تک انسان ان بے شمار قدرت و اختیار کا اندازہ نہیں کر لیتا جو اسے حاصل ہے وہ صحیح طور پر زمین پر خدا کی نمائندگی کا اہل نہیں ہوتا۔ اپنی ذات اور اپنی خودی کے عرفان کی سب سے پہلی منزل یہی ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۔ اِنَّ

اور اللہ نے رات اور دن کو، سورج چاند اور تاروں کو تمہارے تابع بنا دیا۔ یہ سب امر الٰہی کی وجہ سے

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝	تمہارے تابع ہیں۔ بیشک اس میں عقل والی جماعت کے لئے نشانیاں ہیں۔

انسان کے اوپر سب سے اہم فریضہ یہی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کا اندازہ کرکے انہیں اس طرح استعمال کرے کہ وہ نمائندگی کا حق ادا کر سکے۔ یہی وہ مقصد اعلیٰ ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس عمل کو بخوبی انجام دینا ہی ان عظیم نوازشوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

جب انسانی خودی ترقی کرکے نیابت کے فرض کو ادا کرنے کا قصد کرتی ہے تو اس سے پہلے اس کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی صفتوں سے متصف کرے۔ یہ خیال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے لیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے تخلقوا باخلاق اللہ یعنی اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرو۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

خودی کی معراج اس میں ہے کہ وہ خدا کی خودی پر قبضہ حاصل کر لینے کی جد و جہد کرے یعنی خودی کے عمل کی پہل اس بات سے ہوتی ہے کہ وہ زمین اور آسمانوں کی ہر شئے پر قبضہ قدرت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ اس مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جہاں وہ خود خالق کی خودی کو سمجھ لینا چاہتی ہے۔ جب وہ اس منزل پر پہنچتی ہے تو

اس سے وہی اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں جن اعمال کا صدور خود خدا کی ذات سے مخصوص ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کی کہی ہوئی باتیں اللہ کی کہی ہوئی باتیں ہو جاتی ہیں (جس طرح اللہ کہتا ہے کن یعنی ہو جا تو کائنات میں تخلیق کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ کا بندہ مردہ کے سامنے جا کر کہتا ہے قُم اٹھ جا تو وہ مردہ زندہ ہو جاتا ہے یہ اعزاز اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کی خودی خدا کی لازمانی اور لامکانی خودی سے جا ملتی ہے)

خودی کا وجود صرف انسان کے اندر نہیں ہے بلکہ تمام مظاہر وجود میں اس کا وجود شامل ہے۔ مظاہر عالم میں ہر شئے کی خودی اپنا نمود چاہتی ہے:۔

چہ لذت یارب اندر ہست و بود است
دل ہر ذرہ در جوش نمود است
شگافد شاخ را چوں غنچۂ گل
تبسم ریز از ذوق وجود است

(یا اللہ وجود کے اندر کتنی لذت پوشیدہ ہے ہر ذرہ کا دل نمود کے جوش سے بھرا ہوا ہے۔ جب گلاب کی کلی شاخ کو پھاڑ کر عالم وجود میں آتی ہے تو وہ وجود کے ذوق سے مسکرا اٹھتی ہے)

لیکن عالم موجودات کے سارے مظاہر جو جوش نمود سے مست نظر آتے ہیں یہ سارے مظاہر مجموعی طور پر ذات مطلق یعنی خدا کی خودی کے اسرار ہیں۔

ہر فرد کی خودی کے اندر بھی بے شمار عالم پوشیدہ ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ ذات مطلق کی خودی میں بے شمار عالم مظاہر ہیں اگر خودی اپنے وجو کا اثبات کرے اور اس کی حقیقت کو سمجھ لے تو وہ اپنے ماسوا کی خودی کا ادراک کر سکتی ہے اور اس طرح اپنی حقیقت کو جان کر ذات حقیقت کی حقیقت کو جان سکتی ہے۔

خودی کے اندر متضاد صفتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً زندگی جو اپنے تئیں اجتماعی خودی ہے یہ بقا کے اثبات کے لیے تنازع کا خونیں معرکہ گرم کرتی ہے۔ اسے تنازع للبقا میں ایک لذت ملتی ہے وہ اپنے آپ کو ہی اپنا غیر قرار دے لیتی (یعنی زندگی خود زندگی کو اپنا دشمن مان لیتی ہے) اور پھر اسے اس وجہ سے قتل کر دیتی ہے تاکہ وہ اپنی قوت کا اندازہ لگا سکے۔ اسی طرح زندگی اپنے آپ کو فریب میں بھی مبتلا کر لیتی ہے اور اسی فریب میں اپنے لئے سامان حیات ڈھونڈ لیتی ہے۔

زندگی کی اجتماعی خودی کا ایک ہی مقصود ہے اور وہ ہے ایک مرد کامل کی تخلیق اور تکمیل۔ کائنات کے اندر زندگی نے کون و فساد (تعمیر و تخریب یا حیات و موت) کے جو لامتناہی ہنگامے برپا کر رکھے ہیں وہ صرف اسی ایک فرد کامل کی تلاش میں اس نے برپا کئے ہیں۔

زندگی کا شیوہ حرکت و عمل ہے۔ اسے قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنی حرکت و عمل کے لیے زمان و مکان کی تمام وسعتوں پر حاوی ہو جائے اور اپنے سعی و عمل کی رفتار کو ہر طرف تیز کر دے۔ زندگی کی

خودی کبھی افراد کی ذات میں جلوہ فگن ہوتی ہے اور کبھی ملت کی خودی میں رونما ہوتی ہے۔ افراد کی خودی جب ملت کی خودی میں مربوط ہو جاتی ہے تو وہ پہاڑ کی طرح مستحکم ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ملت کی ناقابل تسخیر خودی کو "کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط اور مربوط ہیں) سے تعبیر کیا ہے۔

خودی کی قوت کائنات کے ہر ذرہ میں موجود ہے۔ کائنات کی ہر شے اسی خاموش قوت کی بدولت اپنی ذات کی نمود کرتی ہے خودی کی خاموش قوت ہمیشہ عمل کے لئے اکساتی ہے۔ خودی کی قوت عمل کے لئے عمل کے اسباب کے استعمال کرنے کی پابند ہے۔

حیات عالم کا دارومدار قوت خودی پر موقوف ہے۔ یعنی خودی جتنی مستحکم ہوگی زندگی اسی قدر پائیدار ہوگی۔ لہٰذا مس فطرت میں تمام مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ ایک طرف ایک معمولی قطرہ زور خودی کی وجہ سے موتی بن کر جگمگاتا ہے یا ایک معمولی سبزہ زور خودی کی وجہ سے سینۂ گلشن میں شگافت پیدا کر کے اپنی نمود کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف شمع پگھل کر آنسو کی طرح ٹپکتی رہتی ہے۔ غرض خودی کو اگر قوت حیات حاصل ہے تو وہ وجود فانی کو زندگی جاوداں میں تبدیل کر سکتی ہے۔

خودی کے اندر حرکت وعمل کی قوت اور اپنے اندر استحکام کی قدرت دو ذریعوں سے حاصل ہوتی ہے۔ خودی کو حرکت وعمل پر آمادہ کرنے والی شئے کا نام مقصد ہے اور اس کے اندر استحکام پیدا کرنے والی قوت کا نام

عشق اور محبت ہے

مقصد

خودی کی زندگی کا راز مقصد میں ہے۔ اگر مقصد ظاہر نہیں ہے تو خودی مرجاتی ہے۔ خودی اپنی واقفیت کو بڑھاتی اور تجربے کرتی ہے تو اس لیے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح خودی جب ماحول سے اثر لیتی ہے اور ماحول پر اثرانداز ہوتی ہے تو اس میں بھی وہ اپنے مقصد کے مطابق عمل کرتی ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ خودی ایک رہبر اور رہنما توانائی کے طور پر مقصد کے زیراثر ہی عمل کرسکتی ہے۔

مقصد جس قدر صالح، بلند اور روشن ہوگا۔ خودی کا عمل بھی اتنا ہی صالح، بلند اور روشن ہوگا۔ مقصد اگر صالح اور بلند ہے تو زندگی اس مقصد کی بدولت قوت حیات حاصل کرلیتی ہے۔ حرکت وعمل زندگی کا شیوہ ہے لیکن حرکت وعمل کے لئے قدم اٹھانے پر مجبور کرنے والی قوت مقصد ہے۔

خودی کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بقا کے لئے مقصد کی تلاش کرے اور پھر حصول مقصد کی تمنا کو اپنے دل میں زندہ رکھے۔ تمنا ہی کے اندر کائنات کے وجود کا راز ہے۔ تمنا یوں تو وجود کے ہر ذرہ کی فطرت میں جلوہ آرا ہے۔ لیکن جب انسان کے سینے میں تمنا کی جگہ ہوجاتی ہے تو وہ دل کے اندر بیتابی کی کیفیت پیدا کردیتی ہے اور جب دل پہ تمنا کا عکس پڑتا ہے تو انسان کا دل آئینہ کی طرح گرد وغبار کدورت سے پاک وصاف

ہو جاتا ہے۔ تمنا سے زندگی کا اظہار ہے اور اگر تمنا نہ ہو تو انسان کا پیکر خاکی ایک مزار کی مانند ہے جس میں اس کی مردہ خودی دفن ہے۔ تمنا پیکر خاکی کو طاقت پرواز عطا کرتی ہے اور انسانی ذہن کی رہبری کرتی ہے زندہ وہی ہے جو حصول مقصد کی تمنا کے نشہ سے مست ہے اور سرگرم عمل ہے۔ تمنا کی حرارت ہی زندگی ہے۔ انسانی خودی جب تمنا کی حرارت سے زندہ ہو جاتی ہے تو اس کا میلان صرف مقصد کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا مقصد وہی حق ہے اور باطل جو ناحق ہے ایسے فرد کے دل میں اپنے لئے کوئی گنجائش نہیں پیدا کر سکتا۔

مقصد کیا ہونا چاہیے اسے اقبالؔ کے لفظوں میں دیکھو:۔

مقصدے مثل سحر تابندۂ
ماسوئی را آتش سوزندۂ

مقصد وہ مقصد ہو جو صبح کی طرح روشن اور تابندہ ہو۔ اس مقصد کی آگ اس مقصد حقیقی کے ماسوی کو جلا کر خاک کر ڈالنے والی ہو۔

مقصدے از آسماں بالا ترے
دل ربائے، دل ستانے، دل برے

مقصد وہ ہو جو آسمان سے بھی زیادہ بلند ہو اور اس کے اندر محبوبیت کی ساری شان مثلاً دل ربائی، دل ستائی اور دلبری پائی جاتی ہو۔

عشق و محبّت

اللہ اور رسول سے عشق ایمان کا بنیادی جز قرار دیا گیا ہے لہذا اعلیٰ

صفات کے مومنین کی تعریف از روئے قرآن یہ بھی کیا گیا ہے کہ ان کے دل میں اللہ کی محبت شدت اختیار کر گئی ہے۔ اب سب سے پہلے یہ لازم آتا ہے کہ ہم سمجھیں کہ اللہ اور رسول کے ساتھ محبت کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک شخص کی محبت مال و جاہ کے لیے، اولاد اور اقربا کے لیے اور پھر مرد اور عورت کا جنسی عشق یا وطن اور قوم سے محبت اور اللہ اور رسول کی محبت یا مقصد اعلیٰ کی محبت میں کیا نسبت ہے۔ مقدم الذکر محبت ایک اضطراری فعل ہے جو ہوس اور نفس پرستی کا نتیجہ ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ مادی عشق ہے اس کے برخلاف اللہ اور رسول سے عشق اختیاری فعل ہے اس کا روحانی واسطہ ہے اور یہ عشق بغیر تربیت نفس اور اکتساب عمل کے ممکن نہیں اس عشق کی ابتدا تزکیہ باطن سے ہوتی ہے۔ جب تک انسان کا دل تمام کدورتوں سے پاک نہ ہو لے (یہ کدورت حرص و ہوس کی کدورت ہوگی یا دنیاوی علائق کی) بہر حال ان سے جب تک دل صاف نہ ہوئے اللہ اور رسول کا تصور دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتا۔ اتباع رسول ہی ذریعہ ہے اس روحانی محبت تک رسائی حاصل کرنے کا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	کہہ دیجیے کہ اگر تم کو اللہ سے عشق ہے تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم کو پیار کرے گا۔

رسولؐ کی اتباع اور اطاعت سے جی چرانا کفر ہے۔ کیونکہ ایسی بات خدا اور رسول سے محبت کے منافی ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○

آپ فرما دیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی پھر اگر وہ لوگ توجہ نہ دیں تو بیشک اللہ کافروں سے پیار نہیں کرتا ۔

اللہ اور رسول کی محبت ساری خواہشوں سے افضل ہے :-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادے اور اولادیں تمہارے بھائی اور بیویاں اور سارا کنبہ اور تمہارے کمائے ہوئے مال، اور تمہاری وہ تجارت جس کی نکاسی نہ ہونے کا تمہیں خوف ہو اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو یہ سب یا ان میں سے بعض تم کو اللہ اور اللہ کے رسول سے زیادہ محبوب ہیں یا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے لگتے ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو جب اللہ کا حکم آئے گا۔ اللہ نافرمانی کرنے والوں کو مقصود تک نہیں پہنچاتا ۔

بعض آیات میں خالص نیت بھی اللہ اور رسول کی محبت قرار دی گئی ہے ۔ بخاری شریف میں ہے :-

لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ وما سواھما

کوئی شخص صاحب ایمان اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے لیے اس کے والدین اور اولاد اور ان کے ماسوا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ عبادات اور اذکار ہیں۔ لیکن عبادات واذکار پر مداومت سے محبوبیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد بندہ کا ہر فعل اللہ کی طرف سے ہونے لگتا ہے۔ ایسے شخص پر اللہ کی بخشش بھی ہوتی ہے اور اللہ کی پناہ بھی ملتی ہے۔

وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہ ورجلہ التی یمشی بہ وان سالنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ

جب میرا بندہ عبادات واذکار کے ذریعہ مجھ سے تقرب حاصل کرنے کے فعل پر مداومت کرتا ہے تو اس کے تقرب حاصل کرنے کی کوشش کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں اور جس کو میں محبوب بنا لیتا ہوں میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے سنا جاتا ہے اور آنکھ جس سے دیکھا جاتا ہے اور ہاتھ جس سے پکڑا جاتا ہے۔ پاؤں جس سے چلا جاتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو ضرور میں اس کو دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے

تو ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں ۔ (بخاری شریف)

فرد اپنے وجود کے اعتبار سے فانی ہے لیکن خودی کے استحکام سے وہ دائمی اور ابدی ہو جاتا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ "بقا ہمیں بطور حق کے نہیں حاصل ہو سکتی اس کو جد و جہد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسان اس کا امیدوار ہو سکتا ہے۔" ہمارے پیکر خاکی میں جو شرارۂ حیات ہے وہ مادی نہیں ہے بلکہ وہ تمام تر کثافتوں سے پاک ایک نقطۂ نوری ہے۔ یہ عشق کی بدولت دائمی اور ابدی ہو سکتا ہے۔ وہ عشق جو وجود روحانی کو دائمی بناتا ہے۔ جد و جہد کے اعلیٰ ترین نمونہ کا نام ہے جو اطاعت رسولؐ اور فرمان الٰہی کی اطاعت میں تا حدِ امکان سرگرمی دکھانے سے عبادت ہے۔ اضطراری محبت جو خونی رشتہ یا جنسی کشش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر جاہ و مال کی تمنا میں ہوتی ہے ان میں وجود ذاتی کے ارتقا کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ہم سبھی جانتے ہیں کہ خواجہ ابوطالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے لوث اور والہانہ محبت تھی۔ لیکن یہ محبت ان کی نجات کا سبب نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس اضطراری محبت کے ساتھ اطاعت اور اتباع کے لئے جوش عمل کے جوہر سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کے برخلاف صحابہ کبار رضوان اللہ اجمعین کی محبت جوش عمل کے صادق جذبہ سے ہمکنار تھی اس لئے وہ مردان کامل میں شامل ہوئے اور اگرچہ موت کے فرشتے نے ان کے جسد خاکی کو چھوا۔ مگر وہ ان پر غالب نہ آ سکا بلکہ انہوں نے خود موت کو ہی مسخر کر لیا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ
الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

اور مہاجرین اور انصار میں سے پہلے
سبقت لے جانے والے اور وہ لوگ
جو اخلاص سے ان کی پیروی کرنے والے
ہوئے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ
اللہ سے راضی ہوئے۔

لیکن اس کے برخلاف اضطراری محبت چاہے کتنی ہی شدت کی کیوں نہ ہو محض اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ
كَانُوْا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

پیغمبر صلعم اور دوسرے مسلمانوں کو
جائز نہیں کہ مشرکوں کے لئے مغفرت
کی دعا کریں اگرچہ وہ قربت والے
کیوں نہ ہوں خاص کر جب یہ ظاہر ہو جائے کہ
یہ لوگ دوزخی ہیں۔

وَكَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ
لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا
اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ
لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت
کی دعا مانگنا صرف ایک وعدہ کے
سبب تھا جو انہوں نے اس سے وعدہ
کیا تھا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر
ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ
اس سے بے تعلق ہو گئے۔

اب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اسلامی نقطۂ نظر سے (اقبال کی اصطلاح

میں بھی) عشق نام ہے فرد کی ناقص خودی کی اس کوشش بلیغ کا کہ خودی مطلقہ جو لازمانی اور لامکانی ہے اس سے اتصال پیدا کرے یعنی اپنے محدود اور فانی وجود کو غیر محدود اور لافانی بنانے کی آرزو کی تکمیل کے لئے تمام تر امکانات انسانی کو بروئے کار لانا یہاں تک کہ خودی مطلقہ کے تقرب سے فیض یاب ہو جائے عشق ہے - آرزو کی پختگی اور کاوش وعمل ہی وہ ذریعہ ہیں جس سے خودی معراج عشق تک پہنچ سکتی ہے - ایسی ہی محبت سے خودی کا جوہر چمکتا ہے اور خودی کے پوشیدہ ممکنات ارتقاء پذیر ہوتے ہیں - عشق ہی خودی کے لئے نار حیات اور نور ہدایت ہے - عشق تیغ وخنجر سے نہیں ڈرتا کیونکہ عشق اپنی حقیقت کی رو سے مادی نہیں ہے - عشق کے معمولی اعجاز میں سے یہ ہے کہ عصا سے پتھر کو توڑ کر بارہ چشمے جاری کر دے (جیسا کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سرزد ہوا تھا اور اسی واقعہ سے متعلق اقبال کا وہ تلمیحی شعر ہے جو ضرب کلیم کے سرورق چھپا ہوا ہے ؎

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر)

علم کی طرح عشق کے بھی آداب ہیں اور یہ بھی کسی مرشد کامل کی رہبری سے معلوم ہوتے ہیں - اقبال کہتے ہیں ؎

عاشقی آموز ومحبوبی طلب
چشم نوحی قلب ایوبی طلب

(عاشقی کا فن سیکھو اور محبوبی طلب کرو یعنی یہ دعا کرو کہ خدا تم کو محبوب بنالے۔ نوحؑ کی نگاہِ عاشقانہ اور ایوبؑ کا دل جو آتشِ عشق سے سوزاں تھا طلب کرو۔)

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلی

بوسہ زن بر آستانِ کاملی

(اپنے پیکرِ خاکی سے وہ اکسیر پیدا کرو جو تمہاری ماہیئت کو خاکی سے نوری یا فانی سے ابدی میں بدل دے اور اس کیمیا کے سیکھنے کے لئے کسی مردِ کامل کے آستانہ پر بوسہ دو۔)

شمع خود را ہمچو رومی بر فروز

روم را در آتشِ تبریز سوز

(اپنی شمع کو حضرت جلال الدین رومی کی طرح روشن کرو۔ اس کے لئے فلسفۂ عقلی کو عشق جہاں سوز کی بھٹی میں ڈال دو۔ یہاں پر روم سے مراد فلسفہ و دانائی ہے اور تبریز سے حضرت شمس تبریزی کا جذبۂ عشق مراد ہے اس سے متعلق ایک واقعہ یوں نقل کیا جاتا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی جو اپنے وقت کے بہت بڑے فلسفی اور متبحر عالم تھے درس دے رہے تھے۔ وہاں گھومتے گھامتے مرشدِ کامل حضرت شمس تبریزی تشریف لے آئے۔ انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ کیا پڑھا رہے ہو مولانا نے انہیں عامی اور جنونی سمجھ کر کہہ دیا تم نہ سمجھو گے۔ حضرت شمس تبریزی نے کتاب کو اٹھا کر آگ میں جھونک دیا۔ مولانا واویلا

کرنے لگے۔ شمس تبریزی نے کمال متانت سے کتاب کو آگ کی بھٹی سے نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ تعجب یہ کہ کتاب جوں کی توں تھی۔ مولانا نے شمس سے پوچھا یہ کیا انہوں نے مولانا کے ہی لفظوں میں جواب دیا تم نہ سمجھو گے۔ پھر مولانا کا ان کے پیچھے لگ جانا اور جذب و مستی کے تمام آداب کا ان سے استفادہ کرنا نہایت ہی مشہور واقعہ ہے)

وہ خودی مطلق جس سے تقرب کی جدوجہد خودی کی تکمیل کیلئے ضروری ہے وہ ہمارے دلوں میں ہی نہاں ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ ہم تم سے تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس عشق کے فیوض میں سے یہ ہے کہ انسان کے اندر جلال وجمال دونوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی شوق حقیقی دنیا کی ساری نازنینوں اور مہ جبینوں سے زیادہ حسین اور محبوب ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس کی ہیبت رستموں اور سہرابوں کے دلوں کو لرزا دیتی ہے۔ عشق سے قلب میں توانائی پیدا ہوتی ہے اور پیکر خاکی میں پرواز کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

عشق کی تسخیری قوت کا مبدا اتباع رسول صلعم ہے۔ جب تک آپ کی مکمل پیروی نہ کی جائے عاشقی میں پختگی نہیں پیدا ہو سکتی۔ مسلمان وہی ہے جس کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں ہے کیونکہ مسلمان کی آبرو آپ ہی کے نام کی بدولت ہے۔ آپ لافانی وجود ہیں بلکہ خود ابد (لافانیت) بھی آپ کے اوقات میں سے ایک لمحہ

سے بھی کمتر ہے۔ آپؐ ہی کی ذات سے لافانیت اپنے اندر وسعت پیدا کرتی ہے۔ آپؐ نے عالم ظاہری کے قیام کے دنوں میں بوریا پر اس لئے استراحت فرمایا تاکہ کسریٰ کے تاج آپؐ کی امت کے پاؤں تلے روندے جائیں۔ آپ نے غارِ حرا کی تنہائی اس لئے اختیار کی تاکہ سلطنت اور سلطنت کے قوانین کی تخلیق فرماسکیں۔ آپؐ راتوں کو اس لئے بیدار رہے تاکہ قوم شاہی تخت پر آرام سے سوسکے۔ میدان جنگ میں آپؐ کے تیغ سے فولاد پگھل جاتے تھے لیکن عالم نماز میں آپ کی آنکھیں اشک بار رہتی تھیں۔ آپؐ نے اس عالم میں ایک نئے آئین کا آغاز کیا۔ آپ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ حقیقت یہ ہے کہ مادرِ گیتی نے آپ کے جیسا کسی کو پیدا نہیں کیا ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آپ دنیا میں ہمارے لئے عیوب پر پردہ پوشی فرمانے والے اور محشر میں شفاعت فرمانے والے ہیں کیونکہ دوست و دشمن ہر ایک کیلئے آپ کی ذات سراپا رحمت ہے۔ آپؐ نے سارے عالم کے انسانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں ملا دیا اور حسب ونسب رنگ ونسل کے سارے جھگڑے چکا دیئے۔

آپؐ کے آئینۂ دل سے مومن کی تخلیق ہوئی ہے۔ آپ ہی کی روشنی سے مومن کو روشنی ملتی ہے۔ آپ ہی کی تجلی گاہ مومن کا وجود ہے۔ اور مومن کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ آپ کی محبت میں بیقرار رہو اس کا وجود

روزِ محشر کی طرح آپ کے عشق میں تپ رہا ہو۔ مومن وہی ہے جس کی نظر میں دلبر کا شہر یثرب دو عالم سے بھلا معلوم ہو۔

مومن پختگی کے درجہ تک اس وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ اپنے دل کی خلوت گاہ میں یادِ محبوب میں محو ہو کر اپنے وجود کو بھول جائے یہاں تک کہ وہ حق کی پناہ گاہ میں اپنا مقام حاصل کرے۔ پھر دربارِ حق سے لوٹ کر خودی کے استحکام کے لیے کوشاں ہو اور سب سے پہلے حرص و ہوس کے اصنام کو توڑ کر خالص اللہ سے رشتہ جوڑے۔ اس کے بعد سے عشق کی بارگاہ سے وہ اعجاز حاصل ہو جائے گا کہ وہ آنحضرتؐ کی طرح فاران کی چوٹی پر چڑھ کر نعرۂ حق بلند کر سکتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان خلا کا نائب زمین پر ہو جاتا ہے اور یہی وہ منشاء ہے جس کے لیے آدم کی تخلیق ہوئی۔

خودی مسلمان کو غلبہ اور قاہری عشق کی قوت سے حاصل ہوتی ہے جس مسلمان کے دل میں عشق کا جذبۂ صادق نہیں وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔ عاشقِ حقیقی اپنے کھانے پینے سونے اٹھنے بیٹھنے، دیکھنے اور نہ دیکھنے کے معاملات میں حق کی پیروی کرتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس کی مرضی میں اللہ کی مرضی شامل ہو جاتی ہے۔ قضا و قدر اس کی رضا جوئی کرتے ہیں۔

مسلمان کے لئے سارے محبوبوں میں صادق ترین محبوب آنحضرت صلعم کی ذاتِ گرامی ہے۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اس بات کی حقیقت کو اپنے وجود میں اجاگر کرے تاکہ اس کے اعمال حق کی روشنی میں سرزد ہوں

عاشق صادق شاہانہ تخت و تاج پر بھی فقیرانہ جیتا ہے اس کی نگاہیں ہمیشہ بیدار اور خوف خدا میں مشغول رہتی ہیں۔ سارے مقاصد میں حق کی قربت اس کو سب سے زیادہ مقصود ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے وجود اور اعمال سے شان جلالی ٹپکنے لگتی ہے وہ غیر حق کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اگر صلح کرنے میں غیر حق مقصود ہو جائے تو صلح ایک شر ہو جاتی ہے اور اگر جنگ حق کے لئے کی جاتی ہے تو وہ خیر ہو جاتی ہے۔

خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو کر ایسی عظیم قوت ہو جاتی ہے کہ اس کے لئے کائنات اور نظام کائنات کو اپنے تابع بنا لینا سہل ہو جاتا ہے ؎

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماں دہ عالم شود

(جب خودی محبت کی قوت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی قوت سے عالم کے اوپر اپنے احکام جاری کرتی ہے)

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود

(اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ اس کی انگلی سے چاند کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں پر آنحضرتؐ کے معجزۂ شق القمر کی طرف اشارہ ہے۔)

گدائی

یہاں تک تو باتیں خودی کے استحکام کی ہوئیں۔ اقبالؔ کا کہنا ہے کہ گدائی سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے کیونکہ خودی پاک سیرت خوددار اور غیرت مند ہے اس کی آرزوئیں بلند نگاہ پاک بیں اور قوت خاراشکن ہے۔ یہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتی۔ اور کسی سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کا تقاضا نہیں کر سکتی۔ وہ سارے مطالبے جو غیر اللہ سے کئے جاتے ہیں (مطالبے[1] جس نوعیت کے بھی ہوں) گدائی ہے اور گدائی خودی کیلئے سم قاتل ہے۔

وہ شخص جو سوال کرتا ہے وہ اپنے سوال کے فعل سے کائنات کو مسخر کرنے والی قوت کو مجروح کرتا ہے۔ دوسروں کا احسان قبول کر کے وہ ذلیل اور رسوا ہو جاتا ہے۔ مفلسی اور غریبی کا علاج محتاجی نہیں ہے کیونکہ محتاجی سے محتاجی بڑھتی ہی جاتی ہے اور فطرت ذلیل سے ذلیل تر ہوتی جاتی ہے۔ خودی حرارت شوق اور تمنائے بلند کا نام ہے۔ اس کے اجزاء محتاجی اور بھیک منگی کی وجہ سے بکھر کر ٹوٹ جاتے ہیں۔

---

[1] افسوسناک امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ہاتھ پھیلانے کی وباعام ہو گئی ہے یہاں تک کہ کوئی شادی بھی بغیر مطالبے کے نہیں ہوتی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں میں پوری کی پوری مسلمان قوم ہندوستان میں بھیک منگوں کی قوم ہو جائے گی۔

بھکاری کے دل پر جلوۂ حقیقت آشکارا نہیں ہوتا اس لئے چاہے تمہاری روزی تنگ ہو گئی ہو یا تم نصیب کے چکر میں پڑ گئے ہو۔ طرح طرح کی مصیبتوں کے سیلاب امنڈ آئے ہوں مگر ہرگز ہرگز کسی دوسرے انسان کے دستر خوان سے اپنی روزی طلب نہ کرو کیونکہ اس طرح ناممکن ہے کہ رزق کی کشادگی ہو جو مطالبہ کرنا ہو خدا سے کرو اور مشکلات زمانہ سے مقابلہ کرو مسلمان کا بھیک مانگنا نہایت ہتک کی بات ہے اس سے ملّت اسلامیہ کی آبرو برباد ہو جاتی ہے۔

اب تک خودی کے متعلق جتنی باتیں ہوئیں اس سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ خودی انسان کے شعور یا نفس کے ایک روشن نقطہ کا نام ہے یہ فطرتاً ہر انسان بلکہ موجودات میں سے ہر ایک کے اندر موجود ہے۔ مگر وہ قوت جو خودی ہے اپنے تئیں مطمئن اور خاموش رہتی ہے یہ فرد کے ذاتی اکتساب و عمل پر مبنی ہے وہ خودی کو تیز کرے اور اس کے ارتقا کے سبیل ڈھونڈے۔ ارتقائے خودی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ جوہر قابل بن کر نمودار ہو۔ اقبال کا کہنا ہے کہ خودی اپنی تربیت کے مدارج میں جب تک تین مراحل سے نہ گزر لے وہ اوصاف اعلیٰ سے متصف نہیں ہوتی اس کی تربیت اگر مندرجہ ذیل تین بنیادوں پر ہوئی تو وہ اپنے اندر اوصاف خداوندی پیدا کر لیتی ہے۔ تینوں مرحلے حسب ذیل ہیں:-

(۱) اطاعت (۲) ضبط نفس اور (۳) نیابت الٰہی۔

۱۔ اطاعت

فرائض سے غفلت نہیں برتنا اور احکام کی پیروی کرنا اطاعت ہے۔ یہ فرائض اور احکام اپنے محبوب کی طرف سے عاید ہوتے ہیں بخوبی اطاعت ہی محبت کا عملی اظہار ہے اس سے خودی نکھرتی اور قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ کائنات کو مسخر کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ فرائض دینی اور اللہ اور اس کے رسول کے فرمان قوانین ہیں۔ فطرت کا سارا نظم قوانین کی پابندی پر قائم ہے۔ نالائق اور معمولی لباط کی اشیاء قوانین کی پابند بن کر قوی اور دیرپا ہو جاتی ہیں قوانین کی پابندی کرنے والا چاند اور ستاروں کو اپنے تابع کر سکتا ہے۔ گلاب کی مٹھی میں بند ہو کر ہوا شمیم عطر بیز بن جاتی ہے اور ہرن کے نافہ کی قید میں پڑ کر خون کا ٹکڑا مشک بن جاتا ہے۔ قوانین کی پابندی سے باطن نکھرتا ہے اور دل کے اندر قوت پیدا ہوتی ہے۔ قانون سے غفلت برتنے والا اپنے نقصان کے سامان فراہم کرتا ہے۔ وہی فرد اپنی خودی کو کارآمد اور قوی بنا سکتا ہے جو قوانین کی سختی کا شکوہ نہیں کرتا ہو بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ قانونی حد بندیوں کا پوری سختی کے ساتھ پابند ہو۔

۲۔ ضبط نفس

جب خودی احکام الٰہی کی پابند ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو مستحکم

بنانے کا ارادہ کر لیتی ہے تو دنیاوی خوف و طمع اس کے سامنے حائل ہوتے ہیں ان کے اوپر فتح و قدرت حاصل کرنے کی جد و جہد کا نام ضبط نفس ہے۔ ضبط نفس کے اصول کو اختیار کر کے خوف و حرص کے طلسم کو توڑا جا سکتا ہے۔ یہ ارکان اسلام ہیں جن کے اندر ضبط نفس کے اصول پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک غیر اللہ کے خوف اور طمع سے نجات دلانے کا ذریعہ ہے ان کی پابندی سے اپنے آپ پر پورا پورا اختیار و قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔

انسان کے اندر نفسانیت کا جو مادہ ہے وہ انسان کو خود پرستی خود سری اور خود پروری کی طرف راغب کرتا ہے۔ جوانمردی یہ ہے کہ انسان نفس کی ان کمزوریوں پر فتح پانے کی کوشش کرے جب آدمی کو اپنے نفس پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف جسے اپنے آپ پر قابو حاصل نہیں وہ غلامی کو قبول کرتا ہے اور دوسروں کی اطاعت کے لئے سر جھکا دیتا ہے یوں تو نفس کی تابعداری بھی کم غلامی نہیں ہے۔

طمع اور خوف انسان کی فطرت میں داخل ہے کیونکہ اس کی تخلیق مٹی یا مادہ سے ہوئی ہے۔ انسان کو دنیا اور آخرت کا خوف ہوتا ہے۔ وہ مرنے کے ڈر سے لرزتا ہے اور زمین و آسمان کی بلاؤں سے گھبراتا ہے اسی طرح مال و دولت کی حرص میں مبتلا ہوتا ہے۔ خویش و اقارب بیوی بچے گھر وطن کی محبتوں میں مبتلا ہو کر اپنے خالق سے غافل ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف میں کہا گیا ہے کہ

مال اور اولاد فتنہ ہیں جو انسانی خودی کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک جگہ اور یہ کہا گیا ہے کہ مال و دولت اور اولاد و زن کی محبت میں انسان خدا کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے لئے ہلاکت کا سامان مہیا کر لیتا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ

لا کے معنی "نہیں" کے ہیں اور الہ کے معنی "وہ ذات جو پرستش کے لائق ہو" اسلامی تعلیم میں سب سے پہلا کلمہ جو مومن کے منہ سے ادا ہوتا ہے وہ لا الہ ہے یعنی کسی کی ذات پرستش کے لائق نہیں ہے۔ اس سے سارے اصنام کی نفی ہو جاتی ہے چاہے یہ اصنام اینٹ اور پتھر کے بنے ہوں چاہے انسان کے ذہن نے تراش لئے ہوں مال، اولاد، خویش و اقارب، بیوی، گھر وطن ان سے کسی میں دل لگانا گویا کسی بت کو پوجنا ہے۔ اسی طرح دنیا کا خوف ہو یا جاہ و مرتبہ کا خوف ہو، موت کا ڈر ہو یا بلاؤں کا اندیشہ ہو، یہ سب کبھی غیر حقیقی دیوتا ہیں۔ ان طلسمات کو توڑنے کے لئے لا الہ ایک ڈنڈا کی مانند ہے اس سے سارے ہوس اور سارے خوف کے دیوتاؤں کا سر ٹوٹ جاتا ہے کلمہ لا الہ الا اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ دل سے ہر دیوتا کا خیال نکال کر صرف اللہ کی ذات کا یقین اپنی روح کی گہرائی میں پیدا کرے۔ ایسا آدمی جس کی روح کی گہرائی میں ذات حق کا ہی تصور

جاگزیں ہوگا اس کی گردن باطل خداؤں کے سامنے کسی طرح نہیں جھک سکتی۔ وہ کسی چیز سے نہ خوف کھا سکتا ہے اور نہ مرعوب ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی خوف اس کے دل میں ہوگا تو اللہ کا خوف ہوگا اور ماسوا اللہ کے کسی چیز کو وہ ہرگز اہمیت نہ دے گا۔ کلمہ لا کا یقین رکھنے والا بیوی اور اولاد کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے یعنی ان کی محبتوں میں گرفتار ہو کر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا۔

عالم کیف و کم پیچ در پیچ بھول بھلیاں ہے۔ عقل اس میں سرگرداں اور پریشان ماری پھرتی ہے۔ مگر اس وقت تک جب تک کہ وہ لاالہ الااللہ کا اقرار نہ کرے حقیقت کی منزل تک رسائی نہیں حاصل کرتی لیکن حق پرست لاالہ الااللہ کے رازوں سے بخوبی واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کائنات کا ہر پیکر موجود عبد ہے۔

کلمہ توحید ہم سے عمل کا امتحان لینا چاہتا ہے جب ہم اس یقین پر پہنچتے ہیں کہ دین، حکمت، آئین، زور، قوت اور دبدبہ اور ہر شئے اسی ایک ذات حقیقی سے حاصل ہوتی ہے تو ہم اپنے وجود کے راز سے واقف ہوتے ہیں۔ یہی کلمہ ارباب علم کو حیرتوں میں غوطہ زن کرتا ہے اور ان لوگوں کو جن کے دل میں خدا کی محبت ہے عمل کی توانائی عطا کرتا ہے۔ وہ جو پستی میں پڑے ہوئے ہیں اگر اس کلمہ طیبہ کے درخت کے سایے میں چلے جاتے ہیں تو معزز اور بلند ہو جاتے ہیں۔ ان کا پیکر خاکی نسخۂ کیمیا کی طرح اکسیر ہو جاتا ہے۔

اس کلمہ طیبہ کے اندر وہ قدرت ہے کہ یہ معمولی آدمی کو منتخب روزگار بنا دیتا ہے بلکہ یوں کہیئے کہ اس کلمہ سے بندہ کا ارتقا ایک دوسری نوع میں ہو جاتا ہے۔ جس کے دل میں لا الہ کی حقیقت جاگزیں ہو جاتی ہے اس کی جد و جہد کی رفتار بڑھ جاتی ہے اور اس کی کوشش و کاوش کا جذبہ زیادہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کے دل سے نا امیدی اور شک دونوں دور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اسے عین الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ جب بندگی حق میں ایک فرد پورا اترتا ہے تو اس کے دل پر تمام رازہائے سربستہ منکشف ہو جاتے ہیں۔

لا الہ ملی اور اجتماعی زندگی کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ اسی کلمہ کی بدولت رنگ و نسل اور قومیت کے امتیازات مٹ جاتے ہیں انسان ایک وحدت نامیہ (ORGANIC UNITY) کے طریقے پر نشو ونما پانے لگتا ہے۔ ساری انسانیت ایک برادری ہو جاتی ہے۔

دیگر ارکان

لا الہ الا اللہ کے علاوہ ضبط نفس کے دوسرے اسباب جن سے خودی مستحکم ہوتی ہے اور فرد کی ذات میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ ہیں۔ لا الہ کی حقیقت نماز میں نمایاں ہوتی ہے۔ نمازی جب تک نماز میں مشغول رہتا ہے وہ دنیا میں رہتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے علائق دنیا سے الگ ہو جاتا ہے۔ گو یا وہ تمام

اسباب دنیاوی کو چھوڑ کر خدا کی طرف ہجرت اختیار کرتا ہے۔ یہ ایسی عبادت ہے جو انسان کے نفس سے برائی، ناپاک خیالات اور سرکشی کو دور کرتی ہے۔

روزہ بھوک اور پیاس پر فتح حاصل کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ اس کی بدولت نفس تن پروری کی برائی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

حج سے مومنوں کی فطرت نکھر کر زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ اس سے دنیاوی تعلقات سے نکل کر خدا کی طرف رجوع ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ہجرت کے راز معلوم ہوتے ہیں اور وطن کی محبت کم ہوتی ہے اس عبادت کی وجہ سے پوری ملت میں یکتائی پیدا ہوتی ہے۔ اور اتحاد و یگانگت سے آشنائی پیدا ہوتی ہے۔

زکوٰۃ دلوں سے مال و دولت کی محبت کو نکال دیتا ہے۔ اور یہ پوری ملت کے افراد میں مساوات قائم کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کے اس حکم میں کہ اس وقت تک تمہیں کوئی نیکی نہیں مل سکتی جب تک کہ تم اپنی محبوب چیزوں کو راہِ حق میں خرچ نہ کر دو۔ دل کے اندر قوت پیدا کرنے والا جوہر ہے اس جوہر کی بدولت مومن کی دولت بڑھتی ہے اور دولت کی محبت اس کے دل میں کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔

۳۔ نیابت الٰہی

انسان کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ زمین کے اوپر خدا کی نمائندگی

کرے۔ کسی کی نمائندگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نمائندہ کے اندر وہ سارے اوصاف نمودار نہ ہوں جو ذاتِ حقیقی کے اندر ہیں۔ خدا نے انسان کو زمین کا خلیفہ بنانے ہی تمام عناصر فطرت پر اس کو قدرت و اختیار بخش دیا۔ اس کا مقام کائنات کے اندر جان کی مانند ہوا اور اس کے ماسوا کا وجود جسم کی مانند ہے۔ نمائندۂ حق زمین پر حق کا سایہ ہے اُسے کائنات کے ہر جزو کل کی واقفیت حاصل ہے تاکہ وہ اپنی قوتِ تسخیر سے کام لے کر دنیا میں خدا کے فرمان کو نافذ کرے۔

نائبِ حق کی فطرت ایسی بھرپور فطرت ہے کہ وہ ایک نئی دنیا کی تخلیق کرنے پر قادر ہے اسے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وقت اور زمان کی رفتار کو تیز تر کرے۔ اس کے اثر سے ذروں میں خورشید کی چمک نمودار ہو جاتی ہے اس کی بدولت ہستی کی قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔
ایک حقیقی نائبِ حق کی پیدائش بڑی مشکلوں سے ہوتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہر زمانہ میں جملہ موجودات اور سارے انسان اس حقیقی نائبِ حق کیلئے چشم براہ رہتے ہیں۔ ساری دنیا اس انتظار میں ہے کہ وہ عالم ایجاد کے ہنگاموں کا رونق سب کا نورِ نظر آئے اور قوموں کے پیدا کردہ فتنوں کو دبائے۔ سارے عالم کے انسان کو اخوت اور بھائی چارگی کے رشتہ میں منسلک کر دے محبت کو عام کرے اور امن عالم کو بحال کر دے۔
نائبِ حق یا مردِ کامل بن کر جلوہ گر ہونا خودی کا کمال ہے۔

اقبال کا ملی نظریہ

چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست
می کشاید قلزمی از جوئے زیست

(جب خودی وجود کی قوت کو جمع کر لیتی ہے تو زندگی کی نہر سے ایک سمندر کا راستہ کھول لیتی ہے۔)

اسلامی آئین کے مطابق وحدت ملی سے مضبوط رشتہ قائم رکھنا ضروری ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب خاندان اور نسب کی بنیاد پر عرب جان کی بازی لگایا کرتے تھے اور ایک وہ دور آیا جب مختلف نسل رنگ اور علاقہ کے لوگ بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ صرف اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ساری انسانیت کو ایک تعلق میں بندھ جانے کے لئے قرآن و سنت سے جو احکامات صادر ہوئے وہ قابل غور ہیں۔ اگر یہاں پر التزام جماعت کے متعلق قرآن اور احادیث سے استناد شروع کر دیا جائے تو وہ بذات خود ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ یہاں پر دو ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا	سب کے سب اللہ کے رشتہ سے چمٹ جاؤ اور تفرقہ پیدا نہ کرو۔

ظاہر ہے کہ اس آیت کی رو سے صرف ایک ہی بنیاد حبل اللہ یا

الوہی رشتہ کو اتحاد و یگانگت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے ۔ الوہی رشتہ سارے عالم میں قائم ہے ۔ اسی وجہ سے علامہ اقبال کا کہنا ہے ؎

تمیز رنگ و بو برما حرام است

یا

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَةُ	ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اختلاف اور تفرقہ کرنے لگے باوجودیکہ ان کے پاس ان کی ہدایت کے لئے کتابیں آ چکی ہیں ۔

احادیث میں مذکور ہے :۔

ید اللہ علی الجماعۃ	جماعت پر اللہ کی مدد ہوتی ہے ۔

انسانی وجود کے وحدت نامیہ (ORGANIC UNITY) ہونے کا تصور اسلامی تعلیمات میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے چنانچہ بخاری شریف میں یہ حدیث منقول ہے :۔

مثل المومنین فی توادھم وتعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمی	مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے اعضا ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے اور اس کی بےچینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :-

المسلم للمسلم کالبنیان یشد بعضہ بعضا	مسلمانوں کی مثال دیوار کی سی ہے ہر اینٹ دوسری اینٹ کا سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے ۔

قرآن حکیم میں اسی وحدت انسانی کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے ۔

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَۃٍ	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو وہ رب جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ۔

افراد اور جماعت کے اندر گہرا رابطہ ہے ۔ اگر ایک طرف جماعت میں شامل ہونے کی وجہ سے افراد کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے تو دوسری طرف ایک منظم جماعت کا تصور بغیر افراد کے کرنا ناممکن ہے یعنی جماعتیں افراد کی تنظیم سے بنتی ہیں ۔ افراد کے لئے جماعت کا رابطہ ایک رحمت ہے کیونکہ کسی شخص کا جوہر ذاتی کمال تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ کسی معاشرہ یا ماحول سے براہ راست وابستہ نہ ہو ۔

افراد کی خودی جب جماعت کے پیکر میں اپنا نمود کرتی ہے تو فرد کی ناقص خودی لامحدود وسعت اختیار کر لیتی ہے ۔ فرد کی خودی کا تعلق ایک مخصوص زمانہ کے ساتھ ہوتا ہے ۔ مگر جماعت کی مشترکہ خودی تاریخی روایات سے وابستہ ہو کر ماضی حال اور مستقبل ہر زمانہ سے تعلق جوڑ لیتی ہے ۔

ملت کی خودی بھی فرد کی خودی کی طرح ہے اس کی اکائی کا راز

اس کی کثرتوں میں ہے۔ کثیر النوع افراد کی کثیر خودی ملت کی یکتا خودی میں شامل ہو کر یکتا ہو جاتی ہے۔ جماعت سے وابستہ افراد کی مثال ایک قافلہ کے مسافروں کی سی ہے کہ قافلہ کا ہر آدمی اپنے تئیں اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے بھی قافلہ کا ایک رکن ہے جماعت کا فرد اپنے نشوونما کو جماعت کے نشوونما کے ساتھ قائم رکھتا ہے اس کا جسمانی اور روحانی وجود، ظاہر اور باطن سب کچھ ملت کے رشتہ میں جڑا ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا ہر عمل ملت کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے اور اسلاف کے طریقوں کو برقرار رکھنا اس کے اعمال کا مقصود ہوتا ہے اس لئے اس کے وجود میں بھی ایک تاریخی تسلسل پیدا ہو جاتا ہے

فرد اگر جماعت سے الگ ہو تو وہ مقاصد وجود سے روشناس نہیں ہو سکتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی خودی کی ساری قوت بکھر کر منتشر ہو جائیگی جیسے کہ وہ مسافر جو کارواں سے چھوٹ جاتا ہے اور بھٹک بھٹک کر ہلاک ہو جاتا ہے لیکن یہ جماعت ہے جو فرد کو نظم و ضبط سے آشنا کرتی ہے۔ اس کی زندگی میں اعتدال لاتی اور اسے راہ مستقیم پر گامزن رکھتی ہے جماعت اپنے سارے افراد کو ایک دھاگے میں پرونے کے لئے آئین کا نفاذ کرتی ہے۔ بظاہر آئین کے اندر پابندی ہے لیکن آئین کی پابندی ہی حقیقی آزادی عطا کرتی ہے اور آزادی کی حفاظت کرتی ہے۔

علامہ اقبال جماعت اور ملت سے ملت اسلامیہ ہی مراد لیتے ہیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اقبال کو مندرجہ ذیل حقایق پر کامل یقین تھا۔

(۱) زمان و مکان کا تصور اضافی ہے حقیقت لازمان اور لامکان ہے۔

(۲) عالم کے اندر تکوینی عمل جاری ہے ہر روز اور ہر گھڑی امکانات عالم وجود میں آتے جاتے ہیں ذروں میں وسعتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور کائنات میں تبدیلیوں اور ترقیوں کا عمل جاری رہتا ہے۔

(۳) انسانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی بد اعمالیوں کا محاسبہ ہوتا ہے اجتماعی بدعملی کی سزا ہر قوم کو فوراً بھگتنی پڑتی ہے ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

(۴) پوری نوع انسانی مانند ایک وحدت نامیہ کے ہے جیسا کہ شیخ سعدی رح نے کہا ہے :۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند

اب ان چاروں باتوں کو پیش نظر رکھ کر علامہ کے اس تصور پر نظر کرو کہ کائنات کے اندر انسان جو محض تماشا بیں نہیں بلکہ ایک شریک کار کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ اس رباعی میں اس کی وضاحت کرتے ہیں ؎

نوائے عشق را ساز است آدم
کشاید راز و خود راز است آدم

آدم نغمۂ عشق کا ساز ہے وہ اگرچہ راز کے پردہ کو چاک کرتا ہے مگر خود سراپا راز ہے۔

جہاں او آفریداین خوب تر ساخت } خدا نے دنیا کو پیدا کیا اس نے
مگر با ایزد انباز است آدم } اسے زیادہ حسین بنا دیا

شاید خدا کا شریک کار آدم ہے۔

اسی طرح محاورہ مابین خدا و انسان" میں انسان کے اپنے اور خدا کے کارناموں میں جو رابطہ ہے اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم } تو نے رات پیدا کیا میں نے چراغ
سفال آفریدی ایاغ آفریدم } پیدا کیا۔ تو نے مٹی بنائی میں نے

پیالہ بنایا۔

بیابان و کہسار و راغ آفریدی } تو نے جنگل کہسار اور سبزہ زار
خیابان و گلزار و باغ آفریدم } پیدا کئے میں نے خیابان گلزار

اور باغ پیدا کیا۔

مختصر یہ کہ :۔

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم } میں وہ ہوں کہ پتھر سے آئینہ
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم } بناتا ہوں۔ میں ہی ہوں کہ

زہر سے شربت بناتا ہوں۔

اجتماعیت انسان کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے۔ پوری نوع ایک رشتۂ وحدت میں مربوط ہے۔ یہ تاریخ کے ذریعہ حدود زمانی کی پابندیوں کو توڑ کر لازمانی بن جاتی ہے اس لئے کسی اور بنیاد پر جماعت اور ملت کا تصور نہایت گمراہ کن ہوگا بجز اس بنیاد کے جو پوری نوع کو ایک برادری کے

طور پر سمیٹ لینے کی اہل ہو۔ علامہؒ نے اس پر بہت غور و خوض کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلامی اخوت کے علاوہ کوئی اور بنیاد اجتماعیت انسان کے لئے نہیں ہے۔ شاعر کا یہ تصور محض مذہبی عصبیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ عقل اور ٹھوس حقائق سے استفادہ کیا گیا ہے چنانچہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں رقم طراز ہیں:۔

"اسلام کی حیثیت لاجغرافی ہے اور اس کا مقصد ہے کہ ایک ایسا نمونہ پیش کرنا جو اتحاد انسانی کی اس شکل کے لئے جو بالآخر ظہور میں آئیگی مختلف، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ باہم دگر حریف نسلوں کو اول دولت ایمان سے مالامال کرے اور پھر اس متفرق اور منتشر مجموعے کو ایک ایسی امت کی شکل دے جس کا اپنا بحیثیت قوم ایک شعور ذات ہو۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بایں ہمہ اسلام نے ان ادارات کے ذریعے جن کی تاسیس میں بڑی حکمت سے کام لیا گیا ہے اتنی کامیابی تو ضرور حاصل کر لی ہے کہ اس کے مختلف الجنس پیروؤں میں کچھ نہ کچھ اجتماعی ارادہ اور اجتماعی ضمیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس قسم کے معاشرے کے ارتقاء میں تو بعض ایسے قواعد و ضوابط مثلاً آداب اکل و شرب یا احکام طہارت کا غیر متبدل ہونا بھی جو اجتماعی اعتبار سے بے ضرر رہیں زندگی کے نقطہ نظر سے بڑا قابل قدر رہے۔ کیونکہ ان سے معاشرے میں ایک خاص قسم کا خلوص پرورش پاتا ہے اور اس سے ظاہر و باطن میں ایک ایسی یکسانی اور یکرنگی پیدا ہو جاتی ہے جو تفریق و انتشار اور عدم مجانست کی ان قوتوں کا سدباب

کردیتی ہے جو ایک مرکب اور مخلوط معاشرے میں خوابیدہ رہتی ہیں۔

اجتماعیت کا تعلق کسی خاص قوم یا نسل سے رکھا جائے تو کسی اعلیٰ معاشرے کا امکان نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سارے مذاہب نے انسانی برادری کے رشتہ کو جوڑنے کا عزم کیا مگر کہیں کامیابی نہ ہوئی چنانچہ "یہ امر کہ زندگی کا ادراک بطور ایک وحدت نامیہ کے ہوجائے کچھ دیر ہی کے بعد ہوتا ہے۔ یوں بھی اس تصور کا نشو و نما اس امر پر موقوف ہے کہ اقوام و امم احوال عالم کی اصل رو میں داخل ہو جائیں۔ اسلامی فتوحات کی رفتار چونکہ بڑی تیز تھی اس لئے مسلمانوں کو یہ موقع جلد ہی میسر آگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا۔ لیکن یہ امر کہ نوع انسانی ایک جسم نامی ہے مسیحی رومہ کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ فلنٹ کہتا ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کسی عیسائی یا دولت رومائے کسی مصنف کے حق میں بالخصوص کہی جاسکتی ہے۔ یہ کہ اس کے ذہن میں وحدت انسانی کا ایک مجرد تصور موجود تھا۔ مگر پھر ادمی عہد سے لے کر اب تک صورت حالات کچھ ایسی ہے کہ یہ تصور یورپ کے دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہو سکا۔ برعکس اس کے وطنی قومیت کے نشو و نما سے جس کا سارا زور قومی خصائص پر ہے وسیع انسانیت کا جو عنصر جو مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا برابر دب رہا ہے لیکن اس سے کس قدر مختلف ہے۔ عالم اسلام کی تاریخ۔ یہاں وحدت انسانی کا خیال نہ تو محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا، نہ شاعرانہ خواب بلکہ

روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو چپکے چپکے اور غیر محسوس طریق پر اپنا کام کرتا رہا۔"

عام طور پر یہ بحث کی جاتی ہے کہ اقبال کی شاعری میں وطنی جذبات کا اظہار ہے یا نہیں۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اقبال نے وطنی جذبات سے سرشار ہو کر شروع میں "ہمالہ" "ترانہ ہندی" "نیا شوالہ" وغیرہ قسم کی چیزیں لکھیں۔ مگر رفتہ رفتہ وہ وطن کے تصور سے دور ہٹتے گئے۔ مولانا عبدالحق نے بانگ درا کے تبصرہ میں یہ یقین ظاہر کیا ہے کہ پھر آگے چل کر اقبال وطنی شاعری کو اپنائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ بزعم خود عبدالحق صاحب کے نزدیک، وہ اقبال کی شاعری کا معراج ہوگا۔ یہاں پر ان ساری باتوں کے تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اور نہ اس قسم کے لغو خیالات کے تجزیہ اور تنقید کا کوئی شوق دراصل جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے وطنی اور ملی جذبات کو بہت حد تک سمجھنے کی کوشش کی ہے ورنہ عام طور پر اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا کہ اگر وطن سے محبت کے جذبات ان کے ابتدائی عہد کے کلام میں پائے جاتے ہیں تو یہ بات ان کے بعد کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ وطن سے ملت کی طرف اقدام نہ کوئی ترقی ہے اور نہ ملت سے وطن کی طرف مراجعت کوئی معراج ہوتا۔ اقبال کی پوری شاعری ایک منظم فکر کی آئینہ دار ہے۔ اقبال کے فلسفۂ تمدن میں یہ بات بخوبی ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ اقبال محب وطن ہیں وطن پرست نہیں۔ اسی طرح جمہوریت پسند ہیں مگر مغربی جمہوریت کے

سخت ترین ناقد ان کے فکر کا تانا بانا یہی ہے کہ اول ان کو انسان کی اجتماعیت مرغوب خاطر ہے۔ انسانی اجتماعیت کے لئے اسلامی معاشرہ سب سے موزوں ہے۔ انسان کو آزادی چاہیے وہ آزادی جو آئین کی پابند ہو۔ مگر انسانی جابریت کی تابعداری سے محفوظ ہو۔ وطن سے اس طرح کی محبت کہ ہم اپنے وطن کی زینت کیلئے اپنے خون جگر سے کام لیں۔ ناسازگار حالتوں میں وطنی حمیت کا ساتھ دیں۔ مگر وطنی مفاد کی خاطر دوسروں کے مفاد پر اثر انداز نہ ہوں۔ اگر ایسی کوئی صورت پیدا ہو تو ایثار سے کام لیں۔ وطن پرستی کا جذبہ مکر، غرور، استحصال اور غارت گری کا محرک ہے۔ "انسانی روابط کی پیچ در پیچ دنیا" میں روحانیت کی قدر ہونی چاہیے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع کے موقع پر یہ فرمانا کہ:۔

"آج کے دن سے نہ کسی عرب کو کسی عجم پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجم کو کسی عرب پر تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے (یعنی آدم کا پیکر سب سے اسفل مادہ سے بنا ہے اور یہ کوئی باعث فخر نہیں ہے۔ آفرینش کے اعتبار سے سبھی یکساں حقیر ہیں) بیشک تم میں سب سے عزت والا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہو۔"

انتہائی قابل غور ہے۔ ایسی واضح تعلیم کے سامنے وطن پرستی کا خام تصور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ دنیا نے دیکھا کہ وطن پرستی کے

جذبہ کی وجہ سے دنیا میں غارت گری اور تباہی کی وبا کس قدر عام ہوئی۔

حب الوطن

اب ان میں تضاد کی طرف آتا ہوں جو بظاہر اقبال کے کلام میں پیدا ہے مثلاً اقبال کی وہ ساری نظمیں جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں اور وہ نظمیں جو وطنیت کی سخت ترین مذمت میں لکھی گئی ہیں شاعر کا اعتقاد ان میں سے کیا تھا اس کو پرکھنا چاہیئے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

"میں قوم پرستی (وطنیت) کا مخالف ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے اندر لادینی مادیت کے جراثیم ہیں جنہیں میں عہد حاضر کی سوسائٹی کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔ لوگوں نے اخوت کے تصور کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے چونکہ قومیت کے تصور کی بنیاد وطن پر ہے"

بہت پہلے مسیحیت ریاست کے اصول تنظیم سے قطعی واقف نہ تھی۔ اتفاقاً جب وہ ریاست کے انتظامات کے کام سے وابستہ ہوئی تو یا تو ایک طرف رہبانیت کے اصول تھے یا دوسری طرف رومی شہنشاہیت کے تصورات بطور نتیجہ رومی شہنشاہیت کے اثرات سے وہ اس درجہ متاثر ہوئی کہ رفتہ رفتہ ریاست اور چرچ میں گہری خلیج حائل ہو گئی۔ اب تک ریاست اور چرچ کے اصول میں وہی اختلافات جاری ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام میں حرکت و عمل اور اجتماعی

زندگی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ایک ایسا نظام حیات عمل کی دعوت دیتا ہو وطن پرستی کے محدود اور متعصبانہ نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔

چرچ اور ریاست کے اختلافات جو عیسائیت کے اندر پائے جاتے ہیں اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کی رو سے خلافت (ریاست) کی بنیاد اسی لئے ہے کہ وہ حدود اللہ (دائمی اور عینی اصول اسلام) کو قائم کرے اور توحید کی تبلیغ کے لئے آسانیاں فراہم کرے۔ غرض کہ آئین دینی کا انسانی زندگی پر حاوی و ساری کرنے کے عمل کا ہی نام خلافت ہے ظاہر ہے کہ اسلام میں کسی دوہری عملداری کی گنجائش نہیں ہے۔ عیسائیت میں روحانی اور مادی کی دوہری عملداری قائم ہے۔ افراد کا رشتہ قیصر سے دوسری بنیادوں پر ہے اور چرچ سے دوسری بنیادوں پر بطور نتیجہ اہل مغرب کی مکمل زندگی سے عیسائیت کے اثرات بالکل فنا ہو گئے۔ لیکن اسلام میں ایسا قطعی ممکن نہیں ہے۔ ؎

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبال وطن کے اسی نظریہ کے قائل ہیں۔ اسی نظریہ کی رو سے وہ برہمن و شیخ میں موافقت کے طلب گار ہیں۔ وطنی عظمت اور وطنی حریت کے لئے سرفروشی کا دم بھرتے ہیں۔ اہل وطن کی خوش حالی، نکوکاری اور مروت و محبت کے خواہش مند ہیں وطنیت کا موجودہ تصور جس کی رو سے وطن اور قوم کی خاطر ہر گناہ اور ہر جرم روا رکھا

جاتا ہے۔ اس کے سخت ترین مخالف ہیں۔ جبر و استحصال کی ہر قسم سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ اب یہاں پر ایک اور بدگمانی کا ازالہ لازمی ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اقبال شاہین کے مداح ہیں اور شاہین ایک شکاری پرندہ ہے جو مجبور اور ناقابل دفاع پرندوں کو شکار کرتا ہے۔

شاہین

"بقول زردشت" میں نیٹشے کا ہیرو زردشت ایک غار کے اندر دس برسوں تک خلوت کی زندگی گزارتا ہے۔ جب وہ خلوت میں داخل ہوا تھا تو وہ افسردہ ہو چکا تھا۔ مگر جب وہ باہر نکل کر انسانی آبادی کا رخ کرتا ہے تو وہ سوز یقین سے شعلہ فشاں ہے۔ خلوت کی اس طویل میعاد میں اس کے ساتھی عقاب اور سانپ ہیں۔

بعض لوگ جو اقبال کا معنوی رشتہ نیٹشے سے جوڑتے ہیں وہ اقبال کے عقاب یا شاہین کے تصور اور نیٹشے کے فوق الانسان کے رفیق غار کے درمیان وجہ اشتراک پاتے ہیں۔ بعضوں کا خیال یہ بھی ہے کہ اقبال شیر اور شاہین کی مداحی میں سرگرم اس لئے ہیں کہ وہ فسطائیت اور جابریت کے درپردہ حمایتیوں میں سے ہیں۔ ایسی ساری باتیں بے سر دپا کی ہیں ایسی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اقبال کے فکری اساس کو بخوبی سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

الفاظ، محاورات، استعارے ان میں سے کوئی فکر کی باریکیوں کو کما حقہ ظاہر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا دوسری طرف بیان کے علاوہ کوئی اور صورت بھی نہیں ہے جو احساس اور تجربہ کو ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل کرنے میں معاون ہو سکے۔ اقبال نے فلسفہ کے باریک نکتوں کو زبان شعر میں پیش کرتے ہوئے ہر ممکن ذریعہ بیان کو استعمال کیا ہے۔ شاہین اور شیر اقبال کے ان مصطلحات میں سے ہے جس سے وہ بلند خیالی، دوربینی، جفاکشی، دلیری، استغنا اور ہمہ گیری کے پیکر وجود کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح سے کرگس، زاغ اور خفاش کو اخلاق رذیلہ کے اظہار کے لئے پیش کیا ہے اور حمام، کنجشک، تدرو اور چیونٹی کو مجبوری بیکسی اور کم ہمتی کا پیکر قرار دیا ہے۔

اقبال کے خودی کے تصور اور اصطلاح شاہین میں بنیادی مشابہت ہے۔ جیسا کہ خودی کے ذکر میں کہا جا چکا اقبال کو فلسفہ جبریت سے اختلاف ہے۔ جبریت اسلامی معاشرہ کے اندر تاریخی تسلسل کے ساتھ اس طرح جاگزیں ہو گیا کہ رفتہ رفتہ عملی زندگی سے سراسر محرومی ہو گئی۔

فلسفہ جبریت

انسان عالم کے اندر جد وجہد کرتا ہے کبھی اس کی کوششیں بار آور

ہوتی ہیں۔ ز کبھی بار آور نہیں ہوتیں۔ جب انتہائی کوششوں کے باوجود اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو وہ نفسیاتی طور پر گریز کا رخ اختیار کرتا ہے۔ قسمت، تقدیر، مجبوری اور بے بسی کے تصورات ایسی ہی ناکامیوں کے نتائج ہوا کرتے ہیں جس قوم کے اندر اضمحلال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کی عملی قوت پس پا ہو جاتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ قسمت پر بھروسہ کرتی اور اپنی مجبوری اور بے بسی کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے۔

عجیب اتفاق کہ اسلامی تعلیم میں قسمت پرستی، حرماں نصیبی اور مایوسی کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کے برخلاف یونان و عجم کے اندر یہی تعلیم عام تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان قسمت پرستوں کا ایک فرقہ بھی پیدا ہو گیا جو جبریت کے تصور کو علی الاعلان پیش کرتا تھا۔

فلسفۂ تشکیک

جبریت کے ساتھ ساتھ تشکیک کا فلسفہ بھی مسلمانوں کے معاشرہ میں گھس آیا۔ سب سے پہلے عبد اللہ بن صبا اور ان کے ساتھی جو باطنی کہلاتے ہیں اور قلعۂ التموت میں فرضی جنت بنا کر لوگوں کو فریب دیا کرتے تھے۔ تشکیک کے خیالات کو عالم میں پھیلانے کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ تشکیک کا بھی لازمی نتیجہ بے دلی، محرومی اور مایوسی کے اثرات کا پیدا ہونا ہی ہے۔

بہرحال جبریت اور تشکیک ہمارے شعرار، صوفیا اور عوام کے دل و دماغ میں رچ بس گئے۔ یہاں تک کہ علمار اسلام کا ایک طبقہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پہلے پہل تو جبریت کے مخالفین کھڑے ہوئے اور انہوں نے قدرت واختیار کے تصور کو پیش کیا، یہ عرف عام میں قدریہ کہلائے۔ مگر زمانے کے اثرات بھی اہل جبر کے موافق تھے یعنی زمانہ تیزی کے ساتھ اسلامی معاشرہ کی شکست وریخت پر آمادہ تھا اور عوام الناس کا انحطاط پذیری کی طرف میلان یہ سب کچھ مل جل کر جبریت کے لئے فضا ہموار کر رہے تھے۔

بعضوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ تاریخی طور پر آئے دن حکومتوں کا تبدیل ہونا، جا بجا معرکہ جنگ وفساد کا گرم ہونا حالات کی تغیر پسندی کہ آج ایک شخص حکمراں ہے اور کل دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے جو کھیت ہریالیوں سے لہلہا رہا تھا میدان جنگ میں تبدیل ہو کر سپاٹ زمین میں بدل جاتا تھا۔ یہ سب کچھ حالتیں اس بات کے لئے موافق بھی تھیں کہ تشکیک اور جبریت کے تصور عام ہوتے۔

فلسفیوں کا وہ گروہ جو اشاعرہ کے نام سے موسوم ہے انہوں نے جبریت اور قدریت کے درمیان ایک راستہ اعتدال کا نکالنا چاہا تھا وہ یہ کہ انسان نہ صرف مجبور محض ہے اور نہ صاحب اختیار وقدرت بلکہ قضا و قدر کا پابند ہے اور اکتساب عمل کی صلاحیت رکھتا ہے کہا جاتا ہے کہ اشاعرہ کا اکتساب اہل جبر کی جبریت سے زیادہ مبنی

پہلو رکھتا تھا غرضکہ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خودمختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

کا تصور ہی سیاسی، معاشرتی اور مذہبی زندگی پر حاوی وساری ہوگیا۔

علامہ اقبال نے اس تصور کو گوسفندی اور میشی سے تعبیر کیا ہے۔ گوسفندی اور میشی کا تصور اقبال کے مطابق افلاطون اور نو افلاطونیوں سے ہوتا ہوا عالم اسلام میں جاگزیں ہوا تھا۔

شاہینی وہ اسلامی نظریہ ہے جو عملی زندگی کا محرک ہے۔ اسلامی زندگی کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے اور اظہار اعمال سے ہوتا ہے یہی ایمان وعمل کا پیکر اجتماعی زندگی میں "حزب اللہ (اللہ کی جماعت) کا قالب اختیار کرتا ہے اس پیکر اجتماعی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غلبہ وجلال کا پیکر ہوتا ہے۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝	پس بیشک جو لوگ حزب اللہ میں شامل ہیں وہی غالب رہیں گے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں، کارکشا کارساز

تشکیک وجبریت "غالب وکار آفریں زندگی" کی نمائندگی کے لئے مفید نہیں ہوسکتا بلکہ جبریت پر یقین رکھنے والا غلامی کی زندگی کو قسمت کا فیصلہ قرار دیگا اور تشکیک پر عمل پیرا یہ ٹوٹلتا رہ جائیگا کہ

غلامی بھی مقتضائے حیات میں شامل ہے یا نہیں۔

صرف وہی آزادی، غلبہ اور قدرت کا طلب گار ہو گا جو جہد مسلسل پر کاربند ہو اور یقین محکم رکھتا ہو۔ ابن خلدون نے کچھ اور باتیں بھی کہی ہیں۔ ابن خلدون کے فیصلے تاریخی حقایق ہیں اور ان کی اہمیت کسی طرح کم نہیں کی جا سکتی:۔

"صاحب عصبیت قوم میں خوش اطواری و نیک خصالی اس کی ملک گیری کی نشانی و علامت ہے اسی لئے ہم جن اقوام کے افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ اہل عصبیت بھی ہیں اور جوانب و اطراف کی قومیں ان کے غلبہ و قہر کے ماتحت تو وہ بھلی عادات و خصائل میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور پیش قدمی دکھاتے ہیں۔ کرم گستری اور لوگوں کی لغزشوں کو درگذر کرنا اپنا شیوہ بناتے ہیں۔ بیکسوں کی باتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ مہمان نوازی کی خصلت اپنے میں پیدا کرتے ہیں۔ محنت و مشقت جد و جہد سے جی نہیں چراتے۔ تکلیفوں پر صبر کرتے ہیں۔ ایفائے عہد کو واجب جانتے ہیں۔" مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۹-۱۷۰

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔ "...... تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدویت کی درشتی اور عصبیت و شجاعت کا مادہ ان میں گھٹ جاتا ہے اور یہ نعمتوں کی گودمیں پلنے لگتے ہیں پھر ان کی اولادیں اور آئندہ نسل بھی اسی تعیش میں آنکھ کھولتی ہے۔ خود اپنا کام کرنا نہیں جانتی بلکہ دوسروں سے خدمت لینا جانتی ہے اور عصبیت میں

جن امور کی ضرورت ہوتی ہے اس سے قطعی بیگانہ ہوجاتی ہے اور یہ اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح آگے آنے والی نسلیں بھی عصبیت اور بہادری سے دور ہوتی جاتی ہیں اور عصبیت ان سے منہ موڑتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہی کیفیت پورے قبیلہ کو فنا کے گھاٹ اتارتی ہے۔ اور ختم کرکے چھوڑتی ہے۔

مقدمہ ابن خلدون ص ۱۶۷

اب ان تاریخی شواہد کے پیش نظر شاہین کے تصور کو پرکھئے اور دیکھئے کہ ایک قوم جو تن آسانیوں میں مبتلا ہوکر قعر مذلت میں گر گئی ہے اور غلامی پر اس طرح قانع ہے گویا غلامی زندگی کا لازمہ ہے۔ ایسی قوم کو بیدار کرنے سے عمل پر آمادہ کرنے اور فلاح کے کاموں کے لئے پیش قدمی کرنے کا سبق کیسے پڑھایا جاسکتا ہے۔ اقبال نے بلند نظری، جہد مسلسل، اعلیٰ اخلاق اور جذبۂ فتح و تسخیر کے لئے شاہین کے پیکر کو منتخب کیا چنانچہ شاہین جو محض شکاری پرندہ ہے۔ اس سے اقبال کو قطعی دلچسپی نہیں ہے ؎

زمن گیر این کہ زاغ و خمہ بہتر
ازاں بازی کہ دست آموز شاہیست

(میری یہ بات سن لو کہ قبرستان کا کوا اس شاہین سے بہتر ہے جسے بادشاہ نے اس لئے سدھایا ہے کہ وہ اس کے لئے شکار کریگا) دوسرے لفظوں میں آزادوں میں ذلیل بھی غلاموں میں عزیز ترین سے اشرف ہے۔

اقبال نے شاہین یا بچہ خویش میں مرد حُر کے صفات اس طرح

بیان کئے ہیں :-

تو دانی کہ بازان زیک جوہر اند دلِ شیر دارند و مشتِ پرند	تمہیں خبر ہے کہ سارے باز ایک جوہر سے بنے ہیں ۔ وہ شیر کا دل رکھتے ہیں اور جسامت کے اعتبار سے محض ایک مشت پر ہیں ۔
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش جسور و غیور و کلاں گیر باش	اچھی خصلت اور پختہ تدبیر والے بنو، ہمت ور اور غیرت مند بنو اور اپنے بڑوں کو تسخیر کرنے والے ۔
میا میز با کبک و تورنگ و سار مگر این کہ داری ہوائے شکار	سوائے شکار کرنے کے کسی موقع پر کبھی چھوٹے چھوٹے پرندوں سے مصاحبت نہ رکھو ۔
شد آں باشہ نخچیرِ نخچیر خویش کہ گیرد ز صید خود آئین و کیش	وہ بادشاہ اپنے شکار کا شکار ہو گیا جس نے اپنے شکار کے آئین و دین کو قبول کر لیا ۔
بسا شکرہ افتادہ بر روئے خاک شد از صحبت دانہ چیناں ہلاک	بہتیرے زمین پر پڑے ہوئے شاہین دانہ پر پلنے والے پرندوں کی صحبت میں پڑ کر ہلاک ہو گئے ہیں ۔
نگہ دار خود را و خود سند زی دلیر و درشت و تومند زی	اپنے آپ کی حفاظت کرو اور خوش و خرم جیو، دلیر، سخت اور مضبوط ہو کر جیو ۔

نصیب جہاں آنچہ از خرمی است
ز سنگینی و محنت دیرمی است

دنیا میں اسی کے لیے خوشی کا نصیب ہے جو پتھر کی طرح سخت محنت کش اور دیر دم ہے

مجو انجمن مثل آہو و میش
بخلوت گرا چوں نیاکان خویش

ہرن اور بھیڑ کی طرح محفل آرائی نہ کرو اپنے اسلاف کی طرح خلوت نشینی اختیار کرو۔

چنیں یاد دارم ز بازان پیر
نشیمن بشاخ درختے مگیر

بزرگ بازوں کی یہ نصیحت مجھے یاد ہے کہ کسی درخت کی شاخ پر نشیمن نہ بناؤ۔

کنامی نگیریم در باغ و کشت
کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت

ہم کھیت اور باغ میں آشیانہ نہیں بناتے ہم تو کوہ و صحرا میں اپنی بہشت رکھتے ہیں۔

ز روئے زمیں دانہ چیدن خطاست
کہ پہنائے گردوں خدا داد ماست

روئے زمیں سے دانہ چننا غلط ہے آسمان کی وسعت ہمارے لیے خدا داد ہے۔

نجیبے کہ پا بر زمیں سودہ است
ز مرغ سرا سفلہ تر بودہ است

وہ باعزت جو زمین پر پاؤں کو گھستا ہے گھریلو چڑیوں سے زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے۔

بے شاہبازاں بساط است سنگ کہ برسنگ رفتن کند تیز چنگ	شاہبازوں کیلئے پتھری فرش ہے کیونکہ پتھر پر چلنے سے چنگل ہیں تیزی پیدا ہوتی ہے
جوانے اصیلے کہ در روز جنگ برد مردمک را ز چشم پلنگ	وہ اصیل جواں ہے جو روز جنگ تیر کی آنکھ سے اس کی پتلی نکال لیتا ہے۔
نہ چرخ گردندہ کوژ پشت بخور آنچہ گیری ز نرم و درشت	اس خمیدہ پشت گردش کرنیوالے آسمان کے نیچے نرم اور سخت جو تو حاصل کرے اسے کھالے۔
ز دست کسے طعمہ خود مگیر نکو باش و پند نکویاں پذیر	دو مردوں کے ہاتھ سے لقمہ نہ لو نیک بنو اور نیکوں کی نصیحت قبول کرو۔

تیسرا باب

بانگِ درا کی فطری نظمیں

اقبال کی شاعری کی ابتدا مناظر کشی سے ہوتی ہے۔ وہ فطرت کی مختلف کیفیتوں کا نظارہ کرتے ہیں اور زبان شعر میں ان کی تصویر اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ نقش ذہن کے اندر مرتسم ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ شاعر مشرق نے گرد و پیش کو نہایت باریک بین نظروں سے دیکھا اور اس کے خد و خال کی ہر باریک لکیر کو جو امتیازی طور پر نقش کی شناخت کے لئے ضروری ہیں اپنے ذہن میں مجتمع کرتا گیا۔ اردو میں نظیر اکبرآبادی کو اس سلسلہ میں کافی مہارت حاصل تھی لیکن نظیر ظاہری مشاہدہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اقبال اپنی ابتدائی شاعری میں بھی اس کی گہرائی میں نفوذ کر کے فطری قوانین حیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ خوبی اقبال کو انگریزی شعراء میں خصوصی طور پر ورڈسورتھ کے بہت ہی قریب کر دیتی ہے

قاری کے مطالعہ کی سہولت کی غرض سے یہاں پر بانگ درا کی فطری شاعری کو تین مختلف حصوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) وہ نظمیں محض لفظی مصوری کا کام کیا گیا ہے جیسا کہ نظم ہمالیہ یا ابر کوہسار میں ہے کہ شاعر نے تشبیہہ و استعارہ کی مدد سے مناظر فطرت کی عکاسی کی ہے (۲) وہ نظمیں جس میں شاعر نے اپنی شخصیت کو فطرت کے مخصوص مظاہر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ ہم گل رنگین گل پژمردہ وغیرہ میں پاتے ہیں۔ (۳) وہ نظمیں جن میں شاعر نے مخصوص فطری منظر کو دیکھ کر حقائق حیات پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ (۴) تخیلی مناظر سے متعلق نظمیں۔

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ[۱] کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ[۲] طورِ سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

---

[۱] فصیل = قلعہ کی باہری دیوار جو بہت ہی سنگین اور اونچی ہوتی ہے۔ دیرینہ روزی = قدامت

[۲] جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طورِ سینا پر پہنچے تو انہوں نے خدا کے جلوہ کی روشنی دیکھی جس کی وجہ سے ان کے دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں اسی طرح ہمالہ کے اوپر ایسے دل آویز حیرت انگیز مناظر ہیں کہ جن کو دیکھ کر انسان کے دل پر ان کے بنانے والے یعنی خدا کی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں۔

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اول[۱] فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال[۲] ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ[۳] ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی مانند اڑا جاتا ہے ابر

---

۱ مطلع اول سب سے پہلی غزل کے سب سے پہلے شعر کو کہیں گے۔ دیوان غزلوں کا مجموعہ، ہمالیہ گویا ایک ایسی کتاب ہے جس میں فطرت کی شاعری کے گل بوٹے اور فطری مناظر ابھرے ہوئے ہیں۔ آسمان اس کتاب میں گویا سب سے پہلا شعر ہے ہمالیہ کی بلندی کا نقش اس سے واضح ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہمالیہ میں جو گوناگوں خالق عالم کے مظاہر ہیں وہی انسان کو عزلت اور درویشی کی زندگی کی طرف کھینچتے ہیں۔ ۲ سیال = بہتا ہوا۔ ۳ رہوار = گھوڑا در اصل بادل ہوا کے دوش پر ہی ٹھہرتا اور بکھرتا ہے۔ یہ تشبیہہ نہایت خوبصورت ہے۔

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ[1] قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

۱۔ شاہد = محبوب = قدرت کو ایک حسین محبوبہ سے تشبیہہ دیا گیا ہے۔

گلِ رنگین

توشناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں — اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ سوزشِ محفل نہیں — یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اِس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں — یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
آہ یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں نہیں — کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ الفت کے الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے — راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

لہ عقدہ = گرہ، خراش = چیر کہ لگانا، کھولنے کی کوشش کرنا، کلی مانند گرہ کے ہوتی ہے = عقدۂ مشکل ایسے مسائل کو کہتے ہیں جس کا حل کرنا مشکل ہو۔ دل بھی ایک گل ہے۔ کلی کھلتی ہے مگر یہ نہ کوئی مشکل مسئلہ کا گرہ ہے جس کے کھلنے میں دقت درپیش آتی ہے اور نہ دل ہے جو بند ہوا یعنی مشکلاتِ غم و اندوہ سے دوچار ہوا تو زخمی ہو جاتا ہے مقصود یہی کہنا ہے کہ گلِ رنگین اپنی رنگینیوں کے باوجود فطرت کی گود میں کھلتا ہے اور کلی سے گلاب بننے تک احساسِ غم و اندوہ سے بے نیاز رہتا ہے۔ شاعر نے نہایت خوبصورتی سے گلاب اور انسانی زندگی کے مسائل سے موازنہ کیا ہے۔

میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور[1] ہے | میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں
یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو[2] | یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو | رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو
یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

---

[1] برگ ریاض طور = باغ طور کی پتی، طور ایک پہاڑ ہے جس کی وادی ایمن میں حضرت موسیٰؑ نے خدا کے نور کا نظارہ کیا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ گل بوٹے آدمی پرندچرند غرض کائنات کے اندر جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے خدا کے ہی نور کے جلوے ہیں۔ [2] غور سے دیکھو ان چار مصرعوں میں نہ ہو، ممکن ہے کہ ایسا ہو کے معنی میں مستعمل ہوا ہے جمعیت کے معنی اکٹھا ہونے اور پریشان کے معنی بکھرنے کے ہیں دراصل بے چینی میں انسان کے دل سے اطمینان اور سکون پراگندہ ہو جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب ہے انسان کے اندر جو اضطراب کا مادہ ہے وہ آگے چل کر اطمینان اور سکون کا سبب بن جائے یہ ممکن ہے۔ جام = پیالہ۔ جمشید یا جم ایک ایرانی بادشاہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جمشید نے ہی سب سے پہلے جام کا استعمال کیا۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ جام جم کے اندر ساری دنیا کے احوال دکھائی دیتے تھے۔ آئینہ حیرت سے مراد دل ہے کہ دل آئینہ کی طرح گرد وپیش کے نقوش کا عکس اپنے اندر لیتا ہے اور پھر اس کی صنعتوں کو دیکھ کر متحیر ہوتا ہے۔ دل کا یہ متحیر ہونا ہی ایک وقت ممکن ہے کہ حقیقت کے علم کو اس پر منکشف کر دے۔ متصل = لگاتار۔ توسن = گھوڑا۔ ادراک = سمجھنا۔

عہدِ طفلی

تھے دیارِ نو زمین و آسماں میرے لئے
وسعتِ آغوشِ مادر اک جہاں میرے لئے
تھی ہر اک جنبش نشانِ لطفِ جاں میرے لئے
حرفِ بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لئے

دورِ طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے

تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر
اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

ابرِ کوہسار[1]

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

---

[1] یہ نظم شیلی کے دی کلاؤڈ سے ملتی جلتی ہے لیکن اس نظم کے اندر بالکل ہندوستانی فضا قائم ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی مدد سے پورے طور پر موسمِ برسات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا ناقۂ شاہدِ رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا
بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس وقت لبِ جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں
چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

ابر

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے

ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا، لو برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

ایک آرزو ۱؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

۱؎ اس نظم کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال بھی ابتدائے عہد میں زندگی کے کشاکش سے گھبرا کر پہاڑ کی تنہائی میں گوشہ گیر ہونے کا جذبہ رکھتے تھے دنیا کی تمام تر پیچیدگی اور سارے تکلفات سے کنارہ کش ہونے کا جذبہ نمایاں ہے۔

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پھولوں کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

آفتابِ صبح [1]

شورشِ میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو
زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو

ہو درِ گوشِ عروسِ صبح وہ گوہر ہے تو
جس پہ سیمائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو

صفحۂ ایام سے داغِ مدادِ شب مٹا
آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا

۱۔ اس نظم میں شاعر آفتاب صبح کے نکلنے اور ضیا پاش ہونے کی کیفیت کی عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ خود آفتاب صبح کا کردار پیش کرتا ہے اور اپنی شخصیت سے اس کو ہم آہنگ کرتا ہے۔

حسن تیرا جب ہوا بام فلک سے جلوہ گر — آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر — کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر
ڈھونڈھتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیے

شوقِ آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے — زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کیلیے — آرزو ہے کچھ اسی چشمِ تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں — ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر — اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر — نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر
شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو

تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں — یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں
اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں — ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا

آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے
لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

گلِ پژمردہ

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا
تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا
تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو

ہمچو نے از نیستانِ خود حکایت می کنم
بشنو اے گل! از جدائی ہا شکایت می کنم

ماہِ نو

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

قافلہ تیرا رواں بے منتِ بانگِ درا — گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا
گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو — ہے وطن تیرا کدھر کس دیس کو جاتا ہے تو

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

پیامِ صبح

(ماخوذ از لانگ فیلو)

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا — نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا
جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں — کنارے کھیت کے شانا ہلایا اس نے دہقاں کا
طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنور سے توڑا — اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری — برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا
ہوئی بامِ حرم پر آکے یوں گویا موذن سے — نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا
پکاری اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑی ہو کر — چٹک او غنچۂ گل! تو موذن ہے گلستاں کا
دیا یہ حکم صحرا میں چلو اے قافلے والو — چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
سوئے گورِ غریباں جب گئی زندوں کی بستی سے — تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہرِ خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب سے تم کو جگا دوں گی

عشق اور موت

(ماخوذ از ٹینیسن)

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی
تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی

کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا
عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی

سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے
ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی

کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے
کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی

فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی

عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو
خودی تشنہ کامِ مےِ بے خودی تھی

اٹھی اوّل اوّل گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظارہ تھا پیارا
کہ نظارگی ہو سراپا نظارا

ملک آزماتے تھے پرواز اپنی
جبینوں سے نورِ ازل آشکارا

فرشتہ تھا اک، عشق تھا نام جس کا
کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا

فرشتہ کہ پتلا تھا بے تابیوں کا
ملک کا ملک اور پارے کا پارا

پے سیرِ فردوس کو جا رہا تھا
قضا سے ملا راہ میں وہ قضارا

یہ پوچھا ترا نام کیا؟ کام کیا ہے؟
نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا

ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ
اجل ہوں، مرا کام ہے آشکارا

اڑاتی ہوں میں رخت ہستی کے پرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا

مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
پیامِ فنا ہے اسی کا اشارا

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اس کے پارا

شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا

ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

چاند

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو

آفرینش میں سراپا نور تو، ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں جو خاموشی ہے میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے، تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو، تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ہے تیرے حق میں پیغامِ اجل
محو کر دیتا ہے مجھکو جلوۂ حسنِ ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

رخصت اے بزمِ جہاں

(ماخوذ از ایمرسن)

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

بسکہ میں افسردہ دل ہوں درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں

قید ہے دربارِ سلطان و شبستانِ وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائی کا اسیر

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

چھوڑ کر مانندِ بو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ یہ لذت کہاں موسیقیِ گفتار میں

ہم نشینِ نرگسِ شہلا رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن ہمسایۂ بلبل ہوں میں

شام کو آوازِ چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے
اور چشموں کے کناروں پر سلاتا ہے مجھے

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنجِ عزلت کا ہوں میں
دیکھ لے غافل پیامی بزمِ قدرت کا ہوں میں

ہموطن شمشاد کا قمری کا میں ہمراز ہوں
اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کیلئے

عاشقِ عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں
خندہ زن ہوں مسندِ دارا و اسکندر پہ میں

لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدہ میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی　　پروانہ کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو　　گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی　　چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت　　پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو　　پانی کو دی روانی، موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے، جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل[1] کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا　　واں چاندنی ہے جو کچھ، یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ　　نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے، وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

---

[1] حسن ازل = وہ حسن جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ خدائے مطلق جو کمال حسن ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنا نمود چاہتی ہے، خواہ وہ ایک کلی ہو جو چٹک کر پھول بن جاتی ہے اور مستی کے نشہ میں جھومنے لگتی ہے یا کوئی اور شے ہو۔ نمود کی خصوصیت انفرادی ہے۔ مثلاً جو بات کلی میں ہے وہ بھونرے میں نہیں اور جو بات بھونرے میں ہے وہ نباتات کی کسی صنف میں نہیں۔ غرض کائنات کی ہر شے اپنے اندر ایک انفرادی جوہر رکھتی ہے جو حسن ازل کی متنوع نمود کی ایک معمولی جھلک ہے۔ حسن کے انہیں رنگا رنگ مظاہر کو دیکھ کر حسن ازل کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وحدت کثرت میں جلوہ آرا ہے۔

اخترِ صبح

یہ ستارہ صبح کا روتا تھا اور کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شئے
اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا تابندگی شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر
غمِ فنا ہے تجھے گنبدِ فلک سے اُتر
ٹپک بلندیٔ گردوں سے ہمرہِ شبنم
مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اسکی
بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں

سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

مرے خورشید کبھی تو بھی اُٹھا اپنا نقاب
بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بیتاب
تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں
عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لئے
روشنی ہو تری گہوارہ مرے دل کے لئے

ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوزِ حیات
ہو عیاں جوہرِ اندیشہ میں پھر سوزِ حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں
صفتِ غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کردوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے
ہے گرمِ خرام موجِ دریا
دریا سوئے بحر جادہ پیما
بادل کو ہوا اڑا رہی ہے
شانوں پہ اٹھائے لا رہی ہے
تارے مستِ شرابِ تقدیر
زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر
خورشید وہ عابدِ سحر خیز
لانے والا پیام "برخیز"
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر
پیتا ہے مئے شفق کا ساغر
لذت گیر وجودِ ہر شے
سرمستِ مئے نمودِ ہر شے
کوئی نہیں غمگسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

جلوۂ حسن

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنّا بیتاب — پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
ابدی بنتا ہے یہ عالمِ فانی جس سے — ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا — منظرِ عالمِ حاضر سے گریزاں ہونا
دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے — عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے

آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتمِ دہر میں یا رب وہ نگیں ہے کہ نہیں

بزمِ انجم

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو — طشتِ اُفق سے لیکر لالے کے پھول مارے!
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اُتارے
محمل میں خامشی کے لیلائے ظلمت آئی — چمکے عروسِ شب کے وہ موتی پیارے پیارے
وہ دور رہنے والے ہنگامۂ جہاں سے — کہتا ہے جن کو انساں اپنی زباں میں "تارے"

محوِ فلک فروزی تھی انجمن فلک کی
عرشِ بریں سے آئی آواز اک ملک کی

اے شب کے پاسبانو، اے آسماں کے تارو — تابندہ قوم ساری گردوں نشیں تمہاری
چھیڑو سرود ایسا جاگ اٹھیں سونے والے — رہبر ہے قافلوں کی تابِ جبیں تمہاری
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں — شاید سنیں صدائیں اہلِ زمیں تمہاری

رخصت ہوئی خموشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسماں کی معمور اس نوا سے

حسنِ ازل[1] ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزار انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

سیرِ فلک

تھا تخیل جو ہم سفر میرا
آسماں پر ہوا گزر میرا

اڑتا جاتا تھا، اور نہ تھا کوئی
جاننے والا چرخ پر میرا

تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے
رازِ سربستہ تھا سفر میرا

حلقۂ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا

کیا سناؤں تمہیں ارم کیا ہے
خاتمِ آرزوے دیدہ و گوش

---

[1] حسن ازل کی تشریح کے لئے دیکھو نظم جگنو کی حاشیہ پر۔

شاخِ طوبیٰ پہ نغمہ ریز طیور
بے حجابانہ حور جلوہ فروش

ساقیانِ جمیل جام بدست
پینے والوں میں شورِ نوشانوش

دور جنت سے آنکھ نے دیکھا
ایک تاریک خانہ سرد و خموش

طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ
اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش

خنک ایسا کہ جس سے شرما کر
کرۂ زمہریر ہو روپوش

میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی
حیرت انگیز تھا جواب سروش

یہ مقام خنک جہنّم ہے
نار سے نور سے تہی آغوش

شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے
جس سے لرزاں ہیں مردِ عبرت کوش

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

شبنم اور ستارے

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے
ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے

کیا جانیے تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے
جو بن کے مٹے ان کے نشاں دیکھ چکی ہے

زہرہ نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے
انسانوں کی بستی ہے بہت دور فلک سے

کہہ ہم سے بھی اس کشورِ دلکش کا فسانہ
گاتا ہے قمر جس کی محبت کا ترانہ

اے تارو! نہ پوچھو چمنستانِ جہاں کی
گلشن نہیں اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی

آتی ہے صبا واں سے پلٹ جانے کی خاطر!
بیچاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر

کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
ننھا سا کوئی شعلۂ بے سوز کلی ہے

گل نالۂ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا!
دامن سے مرے موتیوں کو چن نہیں سکتا!

ہیں مرغ نواریز گرفتار غضب ہے
اُگتے ہیں نہ سایۂ گل خار غضب ہے

رہتی ہے سدا نرگسِ بیمار کی تر آنکھ
دل طالبِ نظارہ ہے محرومِ نظر آنکھ

دل سوختہ گرمیٔ فریاد ہے شمشاد
زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد

تارے شررِ آہ ہیں انساں کی زباں میں
میں گریۂ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں

نادانی ہے یہ گردِ زمیں طوف قمر کا
سمجھا ہے کہ درماں ہے دہاں زخمِ جگر کا

بنیاد ہے کاشانۂ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاس فضا پر

شاعر کی منظر کشی کا کمال اس کے تشبیہ و استعارہ کی جدت طرازی میں ہے، بلکہ بسا اوقات لب و لہجہ اور صوتی اثرات سے محاکات کا رنگ بھرتے ہیں۔ منظر کشی کا یہی جوہر رفتہ رفتہ شاعر کو افکار عالیہ کی ترجمانی کے قابل بناتے ہیں اور ان کی شخصیت میں بہ یک وقت ورڈسورتھ، دانتے، مولانا جلال الدین محمد رومی اور گوئٹے کے کمالات کا پرتو نظر آنے لگتا ہے۔

اصوات کی ہم آہنگی سے عجیب طور پر مقصود و مفہوم تک رسائی ہونا ایک ایسا بلیغ حربہ ہے۔ جس کا شعرا برابر سے استعمال کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ فردوسی مرحوم نے کہ "دون سن دنیائے دوں" سے نقارے کی آواز کی بخوبی ترجمانی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی پستی اور سفلہ پن کے لئے ہی الفاظ استعمال کئے گئے مگر درحقیقت آواز نے وہی نقارے کی تھاپ کی آواز سنائی۔ اسی طرح بکثرت مثالیں امیر و خسرو، نظیر اکبر آبادی اور میر کے کلام میں ملتی ہے۔ مگر اس

مخصوص صنعت کو اردو فن بلاغت میں خاص جگہ نہیں ہے۔ انگریزی میں اس صنعت کو
یا
(اصوات جن سے معانی سنائی دیتے ہیں) کہا جاتا ہے۔

س شین، ز۔ ض۔ ظ۔ ذ کی آواز سے سکوت اور خاموشی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ہم بچوں کو چپ کرنا چاہتے ہیں، تو کہتے ہیں "ہشت"۔ حروف مذکور کہلاتے ہیں۔ ان سے سرسراہٹ کے طور پر آواز پیدا ہوتی ہے۔ شاعر نے ایک شام میں اس صنعت کا بخوبی استعمال کیا ہے:۔

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈرل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل تو بھی خموش ہو جا — آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اب دیکھو کہ کس طرح خاموش، فروش، پوش، ہوش اور آغوش کا تلفّظ کرتے وقت واؤ کو کھینچنا پڑتا ہے۔ جس سے شین کی آواز ہُش کی طرح پیدا ہوتی ہے۔ پھر آخری مصرع "آغوش میں غم کو لے کے سوجا" کو پڑھو کیا ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی نیند کا ماتا انسان آخری حصّہ تک بولتے بولتے سو گیا ہے۔

فراق

تلاشِ گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں
یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں
شکستہ گیت میں چشموں کی دلبری ہے کمال
دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال
ہے تختِ لعلِ شفق پر جلوسِ اخترِ شام
بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام
سکوتِ شام جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے
یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفلِ صغیرِ تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرودِ آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

یونہی میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

اس منظر آفرینی میں اس تصور کو غور کرو کہ ایک فراق کا مارا پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہے۔ وہ تنہائی کے احساس سے بہت زیادہ سرگراں ہے۔ اس نے اندھیری رات میں سرود کا آغاز کیا۔ اب اس کی آواز پہاڑی ماحول میں بلند و بالا چٹانوں سے ٹکرائی۔ اس نے اپنے دل کو دلاسا دیا کہ کوئی اور تنہائی سے آزردہ ہو کر نغمۂ فراق الاپ رہا ہے اور اس طرح اپنے غم کا مداوا کرتا اور اپنے آپ کو فریب دیتا ہے۔ یہاں اس نفسیاتی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ آدمی جب تک یہ سمجھتا ہے کہ اس کا غم اس کا ہی غم ہے اور اس کے جیسا کوئی دکھی نہیں تو اس کا غم دوبالا ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں دوسرے بھی اسی کی طرح غم و آلام سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اور ان کے غم کی گہرائی بھی ویسی ہی ہے، تو اس کے دل کو یک گونہ سکون ملتا ہے۔ بلکہ آلام روزگار کو برداشت کر لینے کا جوہر بھی نمودار ہوتا ہے۔ یہی نفسیاتی پرکھ شاعر کی منظر نگاری کو واقعی خوبی عطا کرتی ہے۔

تنہائی

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا
انجم نہیں تیرے ہمنشیں کیا

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش خوابیدہ زمیں جہانِ خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قُدرت تیری ہمنفس ہے اے دل

محبّت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بیخبر تھے لذّتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نَو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلّم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے اُبھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنّا چشمِ آدم سے
سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیا گر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنّائے دلی بر آئی آخر سعیٔ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شئے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے ∴ چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

حقیقتِ حُسن

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیّر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سُنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سُنی

سحر نے تارے سے سُن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

سرگذشتِ آدم

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پر اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

سُنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

بنایا ذرّوں کو ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دور بیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو، برقِ مضطر کو
بنادی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے
عینِ ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے

موج ہے نام مرا، بحر ہے پایاب مجھے
ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے

آب میں مثلِ ہَوا جاتا ہے توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا

مَیں اُچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے
جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے

ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے — کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی — نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو — جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو
سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام — لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا — شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی — منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی
فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل — کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے سرودِ خموش ہے گویا
شجر یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز — ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرمِ ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی — نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی
جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہی — ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

نمودِ صبح

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ شفق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ دار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

چاند

اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے
طوفِ حریمِ خاکی تیری قدیم خو ہے

یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں
عاشق ہے تو کسی کا یہ داغِ آرزو ہے

میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تو فلک پر
تجھ کو بھی جستجو ہے، مجھ کو بھی جستجو ہے

انساں ہے شمع جس کی محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں منزل وہی ہے تیری

تو ڈھونڈتا ہے جسکو تاروں کی خامشی میں[1] — پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے — بلبل میں نغمہ زن ہے، خاموش ہے کلی میں
آ میں تجھے دکھاؤں رخسار روشن اس کا — نہروں کے آئینے میں، شبنم کی آرسی میں

صحرا و دشت و در میں کہسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

نوید صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر — منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموش سفر
محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت — دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات — باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو

وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب — دامن گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز — پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آداب گریز
تو سراپا نور ہے، خوشتر ہے عریانی تجھے — اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

---

[1] اس بند کے لئے نظم "جگنو" کی حاشیہ دیکھو

شعاعِ آفتاب

صبح جب میری نگہ سودائیِ نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی

میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب

تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کر رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے کیا ہے یہ
رقص ہے، آوارگی ہے، جستجو ہے، کیا ہے یہ

خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستیِ خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں

مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے

برقِ آتش خو نہیں، فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالمتاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں

سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں

بیانیہ نظمیں

فطری نظموں کے ساتھ کچھ بیانیہ نظمیں بھی ملتی ہیں، جو یا تو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں، یا کسی غیر ملکی ادب سے مستعار ہیں۔ چند نظمیں طبعزاد ہیں۔ جن میں سے بعضے حسن فطرت کی عکاسی کی وجہ سے فطری نظموں کے

ضمن میں شامل مجموعہ کی جاچکیں۔ ان کا دوبارہ تکرار تحصیل لا حاصل ہے۔ ایسی نظموں میں سرگذشت آدم، محبت، حقیقتِ حُسن، سیرِ فلک کا شمار کرنا چاہیئے۔

ایک مکڑا اور مکھی

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

اِک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن مری کُٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں رکھا
غیروں سے نہ ملئے تو کوئی بات نہیں ہے — اپنوں سے مگر چاہیئے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری — وہ سامنے سیڑھی ہے، جو منظور ہو آنا
مکھی نے سُنی بات جو مکڑے کی تو بولی — حضرت کسی نادان کو دیجئے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اُترا

مکڑے نے کہا واہ فریبی مجھے سمجھیں — تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہو گا
منظور تمہاری مجھے خاطر تھی وگرنہ — کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
اُڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے — ٹھہرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں بُرا کیا
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں — باہر سے نظر آتی ہے چھوٹی سی یہ کٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے — دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے — ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا

مکھی نے کہا خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن
میں آپ کے گھر آؤں، یہ امید نہ رکھنا
ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اس کی
پھانسوں اسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

بچوں کے لئے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور کیا کہنا
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں

کہا یہ سُن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھکو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اُٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے، تو مجھ سا ہنر دکھا مجھکو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بڑا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

اک چراگہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں

تھے اناروں کے بیشمار درخت ——— اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں ——— طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندّی کے پاس اک بکری ——— چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا ——— پاس اِک گائے کو کھڑا پایا
پہلے جھک کر اسے سلام کیا ——— پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں ——— گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی ——— ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے کیا کہیے ——— اپنی قسمت بُری ہے کیا کہیے!
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں ——— رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا ——— پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے ——— اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے
دودھ کم دوں، تو بڑبڑاتا ہے ——— ہوں جو دُبلی تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے ——— کن فریبوں سے رام کرتا ہے
اس کے بچّوں کو پالتی ہوں میں ——— دُودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ بُرائی ہے ——— میرے اللہ! تری دُہائی ہے
سن کے بکری یہ ماجرا سارا ——— بولی ایسا گلہ نہیں اچھّا
بات سچّی ہے بے مزا لگتی ——— میں کہوں گی مگر خُدا لگتی
یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ——— یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں ——— یہ کہاں بے زباں غریب کہاں

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں — لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آزادی — قید ہم کو بھلی کہ آزادی
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا — واں کی گزران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا — ہم کو زیبا نہیں گلا اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو — آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی — آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بُرا بھلا اُس نے — اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا — بُلبُل تھا کوئی اُداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اُڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے — آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب — بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں — اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال — قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی — تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے — دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں — خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر — مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا — دیا اُس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں — مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں
جدائی میں رہتی ہوں میں بیقرار — پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی — گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب — دیا اس نے منہ پھیر کر یہ جواب
رُلاتی ہے تجھ کو جدائی مری — نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا — دیا پھر دکھا کر وہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے — ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

"بانگ درا" کی نظموں میں کردار نگاری

شاعر نے زبانِ شعر میں چند مقتدر ہستیوں کے کردار کو اجاگر کیا ہے اور اس میں معرکتہ الآرا کامیابی حاصل کی ہے۔ سیرت نگاری ایک نہایت ہی مشکل کام ہے اور وہ بھی زبان شعر میں اور مشکل ہو جاتا ہے۔ ان نظموں سے بہتیری شخصیتوں سے ان کی ذاتی عقیدت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

(۱) آفتاب

(ترجمہ گایتری)

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیٔ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزاد قیدِ اول و آخر ضیا تری

زُہد و رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہو معانی

لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسایہ میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبالؔ کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی

پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے اقبالؔ نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے، طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوّف کی تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو اُڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سُنی اپنے احبا کی زبانی
اِک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی
خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گو آپ کو معلوم نہیں اپنی حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنّا ہے کہ اقبالؔ کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر ذرا واللہ نہیں ہے

شاعر (۳)

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

سوامی رام تیرتھ (۴)

ہم بغل دریا سے ہے، اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا بنا، اب گوہرِ نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بُو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بُو
مِٹ کے غوغا زندگی کا شورشِ محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا
نفیِ ہستی اِک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا
چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے
توڑ دیتا ہے بتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیمِ عشق

---

۴ سوامی رام تیرتھ کے کردار پر نظر کر کے شاعر نے فطری اصول کو پرکھا، یہ نگاہ کی دوربینی کی نشانی ہے۔

رام (۵)

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

انسان (۶)

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے

رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو
فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے

تسلیم کی خوگر ہے، جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

شاعر (۷)

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے
پی کے شراب لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مئے خرام سن تو ذرا پیام تو
زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں دختر خوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خم کدہ سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے
شاعر دلنواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری
اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

فاطمہ بنت عبداللہ (۸)

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی ۱۹۱۲ء)

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھ

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے

غلام قادر رہیلہ (۹)

رہیلہ کس قدر ظالم، جفاجو، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستمگر نے
یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے

بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کش کی ممکن تھی
شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے

بنایا آہ! سامانِ طرب بے درد نے ان کو
نہاں تھا حسن جن کا چشمِ مہر و ماہ و اختر سے

لرزتے تھے دلِ نازک، قدم مجبورِ جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے

یوں ہی کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اسکی
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ مغفر سے

کمر سے اٹھ کے تیغِ جانستاں آتش فشاں کھولی
سبق آموزِ تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے
رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تغافل کر رہی تھی نیند گویا چشمِ احمر سے
بجائے خواب کے پانی نے اگلا اسکی آنکھوں سے
نظر شرما گئی ظالم کی دردانگیز منظر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہیئے تمکو نہ کچھ اپنے مقدر سے
مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا
کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

صدیقؓ (۱۰)

اِک دن رسولِ پاکؐ نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سُن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرضکہ مال رسولِ امیںؐ کے پاس
ایثار کی ہے دستِ نگر ابتدائے کار
پوچھا حضورِ سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

مِلکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
اسپِ قمر سُم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضور چاہیئے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانہ کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

عرفی شیرازی (۱۱)

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

فضائے عشق پہ تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشکِ عنابی

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بیتابی

مزاجِ اہلِ عالم میں تغیر آ گیا ایسا
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بیخوابی

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم گو
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

نانک (١٢)

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بےخبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا، جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ! شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

بلال رضؓ (١٣)

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا

ہوئی اسی سے ترے غمکدہ کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایکدم کے لئے
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لئے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو جو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا — اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا — ترے لئے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید — خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر — کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بہ خاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدارِ عام تھا اس کا

(۱۳ ب) بلال رضؓ

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے — اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولانگہ سکندرِ رومی کا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشہِ انجم سپاہ کو — حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا

آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں

لیکن بلالؓ وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جس کی نورِ نبوت سے مستنیر

محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و فقیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال

کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط

صدیوں سے سُن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

(۱۴) پھولوں کی شہزادی

کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں
رہی میں ایک مدت غنچہ ہائے باغ رضواں میں
تمہارے گلستاں کی کیفیت سرشار ایسی ہے
نگہ فردوس در دامن ہے میری چشم حیراں میں
کبھی ساتھ اپنے اس کے آستاں تک مجھ کو تو لے چل
چھپا کر اپنے دامن میں برنگ موج بو لے چل

کلی بولی سریر آرا ہماری ہے وہ شہزادی
درخشاں جس کی ٹھوکر سے ہوں پتھر بھی نگیں بن کر
مگر فطرت تری افتندہ اور بیگم کی شان اونچی
نہیں ممکن کہ تو پہنچے ہماری ہم نشیں بن کر
پہنچ سکتی ہے لیکن تو ہماری شاہزادی تک
کسی دکھ درد کے مارے کا اشک آتشیں بن کر

نظر اس کی پیامِ عید ہے اہلِ محرم کو
بنا دیتی ہے گوہر غم زدوں کے اشکِ پیہم کو

(۱۵) مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[۱] میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری کوئی نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ چیں

۱؎ ویمر، جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کا مدفن ہے

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر / ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرہ ذرہ میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر / یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

داغ (۱۶)

عظمت غالب ہے اک مدت سے پیوند زمیں / مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر / چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے / شمع روشن بجھ گئی، بزم سخن ماتم میں ہے
بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں / ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں

چل بسا داغ آہ! میت اسکی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن، وہ شوخی طرز بیاں / آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے / لیلی معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز / کون سمجھیگا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں　　　اپنے فکر نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے　　　یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی　　　سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بتخانے سے　　　مے پلائیں گے نئے ساقی، نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت　　　ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں　　　تو بھی رو لے خاک دلی، داغ کو روتا ہوں میں

اے جہان آباد اے سرمایۂ بزم سخن　　　ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن

وہ گل رنگیں ترا رخصت مثال بو ہوا　　　آہ! خالی داغ سے کاشانۂ دلی ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں　　　وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رلواتی ہے بیداد اجل　　　مارتا ہے تیر تاریکی میں صیاد اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں　　　ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستاں

ایک ہی قانون عالم گیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے، گلچیں کا دنیا سے سفر

(۱۷) شیکسپیئر

شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیٔ شام آئینہ
برگِ گل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار
شاہدِ مے کے لئے حجلۂ جام آئینہ
حسن آئینۂ دل اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

ہے ترے فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی
کیا تری فطرتِ روشن تھی مآلِ ہستی؟

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

بدرگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ دہلی

التجائے مسافر

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ توام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل　　ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھکو
چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے　　شرابِ عشق کی لذت کشاں کشاں مجھکو
نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں　　کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھکو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں　　تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھکو
مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے　　کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھکو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے　　کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھکو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر　　تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھکو
بنایا تھا جسے چُن چُن کے خار و خس میں نے　　چمن میں پھر نظر آئے وہ آشیاں مجھکو
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں　　کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھکو
وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی　　رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی　　بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں　　کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو
وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمعِ محفلِ عشق　　ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھکو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو　　ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھکو
ریاضِ دہر میں مانندِ گُل رہے خنداں　　کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھکو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

بانگِ درا کی

جذباتی نظمیں

شاعر کا بہتیری چیزوں سے جذباتی لگاؤ ہے، یہ لگاؤ وطن کی بدحالی، غلامی کی زندگی، باہمی نزاع کی وجہ سے ہے یا عالم کے اندر مغربی غلبہ کی وجہ سے اقدارِ عالیہ کے فنا ہونے کے اندیشہ سے ہے۔ وہ ملّت اسلامیہ کی تباہی و بربادی سے بھی انتہائی متاثر ہوتا ہے۔ کہیں وہ اضطرابِ دل کا ذکر کرکے قلبی تاثرات کو پیش کرتا ہے، کہیں ناصحانہ انداز اختیار کرتا ہے اور اصلاحِ حال کے مشورے دیتا ہے۔ شکوہ اپنے تئیں ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں اضطرابِ دل کو بیباکی کے ساتھ خود خدائے عالم کے سامنے رکھا گیا ہے۔ ذیل میں ایسی نظموں کی الگ الگ ترتیب قائم کردی جاتی ہے۔

(الف) ایسی نظمیں جن کا تعلق حبِ وطن سے ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل نظمیں شامل ہیں:۔

(۱) ہندوستانی بچوں کا گیت (۲) پرندے کی فریاد
(۳) ترانۂ ہندی

(ب) ایسی نظمیں جو وطن کے حال زبوں سے متاثر ہو کر قلمبند ہوئیں ان میں:۔ (۱) صدائے درد (۲) تصویرِ درد (۳) نیا شوالہ

(ج) ایسی نظمیں جو ملّت اسلامیہ کے درد میں ڈوب کر لکھی گئیں:
(۱) صقلیہ (۲) بلادِ اسلامیہ (۳) کل ایک شوریدہ خوابگاہِ

نبی پہ درود کے کہہ رہا تھا (۴) شکوہ (۵) جواب شکوہ
(۶) غرۂ شوال (۷) حضورِ رسالت مآب میں (۸) دریوزۂ خلافت

ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سُنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحؑ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینہ
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(۲) پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت، وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کے خوش ہوں نہ سننے والے
دکھتے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

(۳) ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اسکی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا، وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

(۴) صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

بدلے یکرنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

دانہ خرمن نما ہے، شاعرِ معجز بیاں — ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں
حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو — شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو
ذوقِ گویائی، خموشی سے بدلتا کیوں نہیں — میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

(۵) نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

---

(۶) تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اٹھائے کچھ ورق نرگس نے کچھ لالے نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری، نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

"دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
زفیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم"

ریاضِ دہر میں نا آشنائے رازِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ انساں نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں
نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا

مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گُل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سُن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذّتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے، اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ دردآشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر

مگر دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا تو نے
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے
سراپا نالۂ بیداد سوزِ زندگی ہو جا
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے
صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں حنا تو نے
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے
کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے
ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی
دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو رُلواتا ہے شبنم کو
نرا نظارہ ہی اے بوالہوس، مقصد نہیں اس کا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گُل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا
شرابِ بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا
تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں

غلامی ہے اسیر امتیازِ ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثلِ حبابِ آب جو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بےستوں بھی کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے
سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

اسلامیات

(۷) صقلیہ

(جزیرۂ سسلی)

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونبانہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا

غلغلوں سے جن کی لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

آہ اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحرپیما کو رہے
ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موجِ رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حُسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد میں
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد میں
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیبِ اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چُن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگِ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصّہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

(۸) بلادِ اسلامیہ

سرزمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جا چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی
اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز
لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ آغوشِ ارم
جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے رُوما ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیٔ امت کی سطوت کا نشانِ پائدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں پاک ہے
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰ
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولایت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے
جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ! یثرب دیس ہے مسلم کا، تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

قطعہ (۹)

کل ایک شوریدہ، خوابگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم، بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا، جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانہ میں آپ ان کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

شکوہ (۱۰)

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں / فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں / ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم / قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم / نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم / پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم / بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا دستور / کہیں معبود تھے پتھر، کہیں مسجود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر / مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی / اہلِ چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی

اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی　　اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں　　خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں　　کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ ہم پڑھتے تھے چھاؤں میں بھی تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے　　اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے　　سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لئے
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے　　پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے　　تیغ کیا چیز ہے، ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقشِ توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے　　شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوقِ خداوندوں کے پیکر کس نے　　کاٹ کر رکھ دیئے کفّار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی　　اور تیرے لئے زحمت کشِ پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہاں گیر جہاں دار ہوئی　　کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَ اللّٰہُ اَحَد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز　　قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے　　مئے توحید کو لے کر سحر و شام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے　　اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے　　نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے　　تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں　　عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں　　سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صنمخانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دُنیا
رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

دردِ لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی   نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی   امتِ احمدِ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگیٔ غیرِ سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربیؐ کو چھوڑا؟   بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتہ گری کو چھوڑا؟   رسمِ سلمانؓ و اویسِ قرنیؓ کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشیؓ رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی   جادہ پیمائیٔ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی   اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی، تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے   اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے   پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا   قیسِ دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا — گھر یہ اُجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے — سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے اِک سو بیٹھے — تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

اپنے پروانوں کو ذوقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز — لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز — تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

مشکلیں امتِ مرحوم کی آساں کر دے — مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے — یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن — اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں
کچھ مزہ ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

چاک اُس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خُم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لَے تو حجازی ہے مری

(۱۱) حضورِ رسالت مآبؐ میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت پہ لے گئے مجھ کو

کہا حضورؐ نے، اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوش جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
اُڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لیکے تو آیا

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی
چھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

(۱۲) جوابِ شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اُٹھتی ہے، گردوں پہ گذر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

پیرِ گردوں نے کہا سُن کے کہیں ہے کوئی
بولے سیّارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنّت سے نکالا ہوا انساں سمجھا!

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا   عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا   آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا
غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے   تھا جو مسجودِ ملائک، یہ وہی آدم ہے
عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے   ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا   اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نالۂ مستانہ ترا   کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہرِ قابل ہی نہیں   جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں   امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں   تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے

حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا
نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا

کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملّتِ احمدِ مرسل کو مقامی کر لو

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے
تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور
شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور
مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے، موسیٰ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟
ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
اُمرا نشّۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غُربا کے دم سے

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں کہ جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دمِ تقریر بھی مسلم کی صداقت بیباک　　عدل اس کا تھا قوی لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک　　تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق ادراک
خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا　　اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوتِ بازو پر تھا　　ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم　　تم خطاکار خطابیں، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم　　پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی اُن کا تھا، سریرِ کَے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار — تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار — تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے — بُتِ ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے — بے عمل تھے ہی جواں، دین سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانوں میں آباد کیا

قیس زحمت کشِ تنہائیٔ صحرا نہ رہے — شہر کی کھائے ہوا، بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے — یہ ضروری ہے حجابِ رُخِ لیلیٰ نہ رہے
گلۂ جور نہ ہو، شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

عہدِ نو برق ہے، آتش زنِ ہر خرمن ہے — ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے — ملّتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کے رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے، خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں   اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں   سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا   تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا   غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے   نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے   پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا   غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا   امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا، نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری   ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری   کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنّم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے

چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظّارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکْ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا

گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

(۱۳) غرۂ شوال

یا

ہلالِ عید

غرۂ شوال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار

تیری پیشانی پہ تحریر پیامِ عید ہے
شام تیری کیا ہے، صبحِ عیش کی تمہید ہے

سرگذشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
اے مہِ نو، ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے

جس علم کے سائے میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم
دشمنوں کے خون سے رنگیں قبا ہوتے تھے ہم

تیری قسمت میں ہم آغوشی اسی رایت کی ہے
حسنِ روز افزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے

آشنا پرور ہے قوم اپنی، وفا آئیں ترا
ہے محبت خیز یہ پیراہنِ سیمیں ترا

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے انکی خودداری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سُن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیّاری بھی دیکھ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

(۱۴) دریوزۂ خلافت

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

چوتھا باب
بانگ درا کی فکری شاعری

جنگ طرابلس کے زمانہ کی جذباتی نظموں کے بعد اعلیٰ فکری نظموں کی طرف شاعر کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اقبال کی شاعری میں شروع سے آخر تک ایک منظم فکر و فن کی نمائش ملتی ہے فکر و فن کے سلسلہ میں شاعر تدریجی طور پر ناپختگی سے پختگی کی طرف ترقی کرتا رہا ہے۔ چنانچہ ابتدائی نظموں میں (جیسا کہ ہم نے فطری نظموں میں بھی دیکھا کہ) فطرت کی عکاسی کرتے کرتے وہ مناظر فطرت کے اصول کو دریافت کرنے لگتے ہیں اور پھر اس کی ہم آہنگی انسانی فطرت میں تلاش کرتے ہیں

فکر کی تدریجی ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے بھی ضروری ہے کہ مختلف افکار کی ترتیب قائم کی جائے اور اسے مختلف ایسے خانوں میں جمع کیا جائے جس سے شاعر کے انداز فکر کا صحیح اندازہ ممکن ہو سکے۔

(۱) وہ نظمیں جو عقل و دل کے فلسفہ کی وضاحت کرتی ہیں۔ عقل علم کی طرف رہبری کرتی ہے مگر وہ استدلالات سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ ذہن انسانی کو تذبذب میں چھوڑ جاتی ہے مگر عشق الہامی علم کا ذریعہ ہے یہ چوں و چگون سے بے نیاز ہے اور انسان کی علم قطعی تک رہبری کرتی

ہے

(۱) عقل و دل ۔ (۲) شمع اس کی مثالیں ہیں۔

(ب) وہ نظمیں جو جہادِ زندگانی میں پیہم عمل کے لئے ترغیب دیتی ہیں ان میں یہ نظمیں شامل کی جاتی ہیں :۔ (۱) آفتابِ صبح (یہ نظم منظری نظموں کے ساتھ نقل کی جا چکی ہے اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ۔ (۲) طلبائے علی گڈھ کالج کے نام (۳) چاند اور تارے (۴) کوشش ناتمام (۵) پیامِ عشق (۶) عبدالقادر کے نام (۷) خطاب بہ جوانانِ اسلام (۸) ایک مکالمہ (۹) ارتقاء

(ج) وہ نظمیں جن میں کائنات کے ہر ذرہ کے اندر اس مخصوص جوہر کی پرکھ ملتی ہے وہ جو تمام مادی اشیا میں بے بصر جوہر ہے اور آدمی کے اندر جوہر معلوم ہے وہی جوہر جو اقبال کی آمنده کی بالیده نظموں میں خودی کے نام سے موسوم ہوتی ہے ۔ یہ خودی یا جوہر حیات خدائے مطلق کے اعلی جوہر یا جوہر مطلق کا ایک مظہر ہے جو موجودات میں سے انفرادی طور پر ہر ایک میں موجود ہے۔ ایسی نظموں میں مندرجہ ذیل نظموں کو شریک کیا جاتا ہے۔

(۱) شمع و پروانہ (۲) شمع (یہ نظم اوپر نقل کی جا چکی ہے) (۳) جگنو (یہ نظم منظری نظموں کی ذیل میں مندرج ہو چکی) (۴) بچہ اور شمع (۵) .... کی گود میں بلی دیکھ کر (۶) بزم انجم (۷) چاند (یہ دونوں نظمیں منظری نظم کے ذیل میں درج کی جا چکی ہیں ۔) (۸) سلیمیٰ ۔

(د) وہ نظمیں جو اعلیٰ مقاصد کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

(۱) بچے کی دعا (۲) ہمدردی (۳) صبح کا ستارہ (۴) رات اور شاعر (۵) دعا (۶) محاصرہ ادرنہ (۷) پھول (۸) معراج (۹) آفتاب صبح (منظری نظموں میں دیکھو)۔

(ہ) وہ نظمیں جو شاعر کے سیاسی موقف کی وضاحت کرتی ہیں۔ اقبال کے فلسفۂ تمدن کی پہلی کڑی جسے کہا جا سکتا ہے۔

(۱) وطنیت (۲) شمع اور شاعر (۳) مسلم (۴) مذہب (۵) پیوستہ رہ شجر سے .... (۶) خضر راہ۔

(و) ایسی نظمیں جو غم و یاس و حسرت میں امید کی ضو فشانی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان میں ذیل کی نظمیں شامل ہیں۔

(۱) انسان اور بزم قدرت (۲) اختر صبح (۳) نوائے غم (۴) گورستان شاہی (۵) فلسفہ غم (۶) والدہ مرحومہ کی یاد میں (۷) اسیری (۸) طلوع اسلام۔

(ز) بعض ایسی فکری نظمیں جو مندرجہ بالا خانوں میں رکھی نہ جا سکیں:

(۱) خفتگان خاک سے استفسار (۲) گل پژمردہ (۳) طفل شیرخوار (۴) ایک پرندہ اور جگنو۔

---

(۱) عقل و دل

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکوں کی رہنما ہوں میں
ہوں زمیں پر گزر فلک پہ مرا
دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا
مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
ہوں مفسر کتابِ ہستی کی
مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
بوند اک خون کی ہے تو لیکن
غیرتِ لعل بے بہا ہوں میں
دل نے سن کر کہا یہ سب سچ ہے
پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش ربِّ جلیل کا ہوں میں

(۲) شمع

بزمِ جہاں میں مَیں بھی ہوں اے شمع دردمند
فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند

دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے　　　اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو

ہر حال اشکِ غم سے رہی ہمکنار تو

یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز　　　میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز

کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا　　　میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

ہے شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں

پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلّیٰ سے دور ہے　　　بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں　　　بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں

میں جوشِ اضطراب میں سیماب وار بھی　　　آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا

احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار　　　خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے　　　گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے

بُستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی

اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی

صبحِ ازل جو عشق ہوا دلستانِ عشق،　　　آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ　　　اک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی　　　شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیٔ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع! انتہائے فریبِ خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
مضموں فراق کا ہوں ثریا نشاں ہوں میں
آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سُست ہے مضمون بلند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

(۳) طلبائے علی گڑھ کالج کے نام

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

آئی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکون — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا — اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

شمع سحر یہ کہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز — غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

(۲۷) چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے

نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا چلنا مدام چلنا

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے

رہتے ہیں ستم کش سفر سب — تارے، انساں، شجر، حجر سب

ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا

کہنے لگا چاند ہمنشینو! — اے مزرع شب کے خوشہ چینو

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہب، زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن

آغاز ہے عشق انتہا حسن

(۵) کوشش ناتمام

فرقت آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح چشم شفق ہے خوں فشاں اختر شام کیلئے
رہتی ہے قیس روز کو لیلیٔ شام کی ہوس اختر صبح مضطرب تاب دوام کے لئے
کہتا تھا قطب آسماں قافلہ نجوم سے ہمرہو، میں ترس گیا لطف خرام کیلئے
سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لئے
حسن ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں کہتے ہیں بیقرار ہے جلوۂ عام کیلئے

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

(۶) پیام عشق

سن اے طلبگار درد پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا میں غزنوی سومنات دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا
نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے تمام ساماں ہے تیرے سینہ میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا جہاں کا فرض قدیم ہے تو، ادا مثال نماز ہو جا
نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا
گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرا نورد یوں کا جہاں میں مانند شمع سوزاں میان محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیٔ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

(۷) عبدالقادر کے نام

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادۂ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہرچہ در دل گذرد وقفِ زبان دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہان دارد شمع

(۸) خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارا
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
"غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را"

(۹) ایک مکالمہ

اک مرغِ سرا نے یہ کہا مرغِ ہوا سے
پردار اگر تو ہے تو کیا میں نہیں پردار؟
گر تو ہے ہوا گیر تو میں بھی ہوں ہوا گیر
آزاد اگر تو ہے نہیں میں بھی گرفتار
پرواز خصوصیت ہر صاحبِ پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغانِ ہوا مائلِ پندار
مجروح حمیت جو ہوئی مرغِ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتارِ دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تری پرواز کی لیکن سرِ دیوار
واقف نہیں تو ہمتِ مرغانِ ہوا سے
تو خاک نشیمن، ہمیں گردوں سے سروکار
تو مرغِ سرائی، خورش از خاک بجوئی
ما در صددِ دانہ بانجم زدہ منقار

(۱۰) ارتقا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحرگاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش — ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید — میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند

(۱۱) شمع و پروانہ

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع پیار کیوں — یہ جانِ بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟
سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے — آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟
کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا — پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا؟
آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا — شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا
غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو — اس تفتہ دل کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو
گرنا ترے حضور میں اسکی نماز ہے — ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے — چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے
پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی — کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

(۱۲) بچہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پروانہ خو — شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو
یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا — روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا

اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے

شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے — آہ! اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا — تجھکو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی — ہے غبار دیدۂ بینا حجاب آگہی

زندگانی کہتے ہیں جسکو فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرہ میں ہے طوفان حسن
حسن کوہستاں کی ہیبتناک خاموشی میں ہے — مہر کی ضوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت، شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلک نا آشنا کی کوشش رفتار میں
ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن — شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے — زندگی اسکی مثال ماہی بے آب ہے

(۱۳) ..... کی گود میں بلّی دیکھ کر

تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے — رمزِ آغازِ محبت کی بتا دی کس نے
ہر ادا سے تری پیدا ہے محبت کیسی — نیلی آنکھوں سے ٹپکتی ہے ذکاوت کیسی

دیکھتی ہے کبھی ان کو، کبھی شرماتی ہے — کبھی اٹھتی ہے کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے
آنکھ تیری صفتِ آئینۂ حیران ہے کیا — نورِ آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا

ارتی ہے انھیں پونچھوں سے عجب ناز ہے یہ — چھیڑ ہے یا غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ
شوخ تو ہوگی تو گودی سے اتارینگے تجھے — گر گیا پھول جو سینہ کا تو مارینگے تجھے

یا تجسس ہے تجھے کس کی تمنائی ہے — آہ کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے
اص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں — صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں

یشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق — روحِ خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق
ل کے ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی — نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے، کہیں اشک کہیں شبنم ہے

---

(۱۴) سلیمیٰ

ی کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے — خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں
فی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
ی چمک ہے پیدا، جس کی مہک ہویدا — شبنم کے موتیوں میں، پھولوں کے پیرہن میں

صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر　　ہنگامہ جس کی دم سے کاشانۂ چمن میں

ہر شئے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا

(۱۵) بچے کی دعا

(ماخوذ۔ بچوں کے لئے)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت

جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب　　علم کی شمع سے ہو مجھکو محبت یارب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا　　درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ برائی سے بچانا مجھکو

نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھکو

(۱۶) ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　اڑنے چگنے میں دن گذارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک　　ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سن کر بلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(۱۷) صبح کا ستارہ

لطف ہمسائگی شمس و قمر کو چھوڑوں
اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی
اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا عدم آباد وطن ہے میرا
صبح کا دامن صد چاک کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
ساقی موت کے ہاتھوں سے صبوحی پینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی
اس گھڑی بھر کے چمکنے سے یہ ظلمت اچھی
میری قدرت میں جو ہوتا تو نہ اختر بنتا
قعر دریا میں چمکتا ہوا گوہر بنتا
واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا
چھوڑ کر بحر کہیں زیب نگہ ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر
زینت تاج سر بانوئے قیصر بن کر
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست
ہے گہر ہائے گرانمایہ کا انجام شکست
زیب پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبہ جاگا
خاتم دست سلیماں کا نگیں بن کے رہا

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل　　کیا وہ جینا ہے کہ ہو اس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینت عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں رہوں　　کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں
اشک بن کر سر مژگاں سے اٹک جاؤں میں　　کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور　　سوئے میدان وفا حب وطن سے مجبور
یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو　　جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو
جس کو شوہر کی رضا تاب شکیبائی دے　　اور نگاہوں کو حیا طاقت گویائی دے
زرد رخصت کی گھڑی عارض گلگوں ہو جائے　　کشش حسن غم ہجر سے افزوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں　　ساغر دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں

خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانہ کو دکھاتا جاؤں

(۱۸) رات اور شاعر

رات

کیوں مری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں　　خاموش صورت گل مانند بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو　　مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو
یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے　　رفعت کو چھوڑ کر جو بستی میں جا بسا ہے
خاموش ہو گیا ہے تار رباب ہستی　　ہے میرے آئنے میں تصویر خواب ہستی

دریا کی تہ میں چشم گرداب سو گئی ہے
ساحل سے لگ کے موج بیتاب سو گئی ہے

بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے
یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے

شاعر کا دل ہے لیکن ناآشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا ہے کیونکر مرے فسوں سے

شاعر

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھپ کے انسانوں سے مانند سحر روتا ہوں

دن کی شورش میں نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں
عزلت شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں

مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو
تپش شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو

برق ایمن مرے سینہ میں پڑی روتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے

صفت شمع لحد مردہ ہے محفل میری
آہ! اے رات بڑی دور ہے منزل میری

عہد حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اسکو
اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اسکو

ضبط پیغام محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

(۱۹) دعا

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادی فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے

محروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر
اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلیٰ دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہم دوش ثریا کر
خودداری ساحل دے، آزادی دریا دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر دل صورت مینا دے

احساس عنایت کر آثار محبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

(۲۰) شب معراج

اختر شام کی آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

(۲۱) پھول

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انھیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے
نہ رہ منت کش شبنم نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

اسی میں دیکھ مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھ کو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے

(۲۲) وطنیت

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(۲۳) شمع اور شاعر

شاعر

دوش می گفتم بہ شمع منزل ویران خویش
گیسوئے تو از پر پروانہ دارد شانہ

کل رات میں نے اپنے ویرانے میں جلتی ہوئی شمع سے کہا:۔
تیرے گیسو پروانے کے پروں سے سنوارے جاتے ہیں۔

در جہاں مثل چراغ لالۂ صحرا ستم
نے نصیب محفلے نے قسمت کاشانۂ

میں دنیا میں لالۂ صحرائی کی مانند ہوں جسکی قسمت میں نہ کوئی محفل ہے نہ کوئی محل۔

مدتے مانند تو من ہم نفس می سوختم
در طواف شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ

میں تیری طرح ہی ایک مدت تک جلتا رہا ہوں لیکن میرے شعلہ کے طواف کے لئے کسی پروانہ نے پر نہ پھڑپھڑایا۔

می تپد صد جلوہ در جان امل فرسودۂ من
بر نمی خیزد ازیں محفل دل دیوانۂ

میری جان میں اگرچہ امید کی جھلک ہے اس سیکڑوں جلوے تڑپ رہے ہیں لیکن اس محفل سے کوئی دیوانہ دل اٹھتا نہیں

از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی
کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی

تونے دنیا کو روشن کرنے والی یہ آگ کہاں سے جمع کی پروانہ کو جسکی کوئی بساط نہیں ہے تونے کلیم کا سوز سکھلایا کیسے۔

شمع

مجھکو جو موج نفس دیتی ہے پیغام اجل
لب اسی موج نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک
شبنم افشاں تو، کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثل چراغ لالۂ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

اور ہے تیرا شعار آئین ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا

اے دُرِ تابندہ! اے پروردۂ آغوش موج!
لذتِ طوفان سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے — لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے — ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی — پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ — صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا! — اب کوئی سودائیِ سوزِ ناتمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو

کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا! — تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

رشتۂ اُلفت میں جب انکو پرو سکتا تھا تو — پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں — فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے

شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا! — تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کسے؟ — اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے — کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں — رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی — شہر انکے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی — وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے — موج کی آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

خوگرِ تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بدامن ہو گئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکان تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش

پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب کے متوالے خموش

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگامِ خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش

در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تُو، گلشن میں مثلِ جُو ہوا

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بُو ہوا

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر، بڑی دولت ہے یہ — زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی — جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ — یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر
خیمہ زن ہو وادیٔ سینا میں مانندِ کلیم — شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم — صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر
تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو — عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیف کچھ باقی پُرانے کوہ و صحرا میں نہیں — ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھکو مقدر نے ملایا ہے اگر! — تو عصا اُفتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں اسی شاخِ کہن پر پھر بنالے آشیاں — اہلِ گلشن کو شہید نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل — یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو[1]

---

[1] تمام مذاہب عالم کے برخلاف اسلام میں نہ مذہب و ریاست کی تفریق ہے اور نہ مذہب ریاست اور موبد کی تثلیث - آئین مذہب اور آئین ریاست ایک ہی ہیں - ہر فرد سے امید کی جاتی ہے کہ وہ علم دینی سے مستفید ہوگا - کوئی شعار دینی ہو - مثلاً امامت نماز (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو ساحل بھی تو

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو محمل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

(گذشتہ سے پیوستہ) یا تکبیر اذان یا کوئی معاشرتی تقاضا ہو۔ مثلاً نکاح یا ختنہ، یا کوئی سراسر دنیاوی معاملہ ہو۔ مثلاً ملکی یا مدنی مصلحتوں پر غور و فکر، ہر معاملہ شریعت کے نقطۂ نظر سے حل ہوگا اور حل کرنے والا کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ برہمن یا دری وغیرہ قسم کی کوئی شرط نہیں۔ بزرگی و برتری البتہ اہلِ تقویٰ کو ہے۔ مگر جس طرح نماز میں کوئی امامت کے لیے کھڑا ہو گیا، تو مفتی، مولوی، قاضی، قطب ابدال غرض کوئی بھی ہو اس کے پیچھے ہی کھڑا ہوگا۔ اسی طرح ہر شعبۂ حیات میں یہی اصول کارفرما ہے

لہ عہدِ زوال میں طبقۂ علماء کا فرد ٹھیک (PRIEST CLASS) (موبدان مذاہبِ غیر) کی طرح ہو گیا۔ جہاں ہر فرد بشر کو دین کا علم فرض تھا۔ وہاں وہ چھوٹے بچوں کی طرح دوسروں کے سہارے کا محتاج ہو گیا۔ شاعر زندگی کے اسی پہلو پر اظہار افسوس کرتا ہے۔ اقامتِ دین، تبلیغ دین اور پیروئی احکام دین ہر ایک پر فرض ہے اور ہر ایک اس کا مکلف ہے کسی کا درشہ نہیں صرف مرتب آئین کی پیروی کرنی ہے، کسی فرد خاص کی نہیں۔

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھکو یاد وہ پیماں بھی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہمنفس بادِ صبا ہو جائے گی

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اُسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(۲۴) مُسلم

جون ۱۹۱۲ء

ہر نفس اقبال تیرا آہ سے مستور ہے
سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے

نغمۂ امید تیری بربطِ دل میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلیٰ تیری محمل میں نہیں!

گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ترا
اور دل ہنگامۂ حاضر سے بے پروا ترا

قصۂ گل ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں
اہلِ محفل تیرا پیغامِ کہن سنتے نہیں

اے درائے کاروانِ خفتہ پا خاموش ہو
ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش ہو

زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں
شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

ہمنشیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مُسلم کے تخیّل میں جسارت اس سے ہے

حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا

دہر میں غارت گرِ باطل پرستی میں ہوا
حق تو یہ ہے حافظِ ناموسِ ہستی میں ہوا

میری ہستی پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومیدِ پیکارِ حیات

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملّت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پُرانی داستاں کہتا ہوں میں

یادِ ایامِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

شمع اور شاعر کی خصوصیات

اس نظم میں شاعر اور شمع کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ شاعر انسان ہے اور شمع غیر ذی روح۔ شاعر نے شمع کو مشخص کر کے اس کے تاثیر کے راز کو دریافت کیا ہے۔ شمع کے اندر روشنی ہے اور شعلہ بھی، یعنی نور و نار کا مجسمہ ہے۔ یہ نار گویا آتشِ حسن ہے، یا آتشِ جذبِ دل، بے شمار پروانے، اس کے گرد طواف کرتے اور اس کے شعلہ پر نثار ہو جاتے ہیں۔ شاعر کے دل میں بھی ایک آگ روشن ہے۔ وہ آگ عرفان کی آگ ہے۔ وہ پروانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس کی آگ کا بھی طواف کریں مگر شاعر کا کوئی ہمنوا نہیں ہے یعنی اس کے اندر وہ کشش نہیں، جو شمع کے اندر موجود ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

شمع ایک طویل بیان دیتی ہے۔ شمع کو حقیقت کا بہتر علم ہے۔ وہ دس بندوں کی نظم میں جو باتیں کہتی ہے، اس کا لب لباب یہی ہے کہ:-

(۱) بغیر خلوص و ایثار کے پروانے جمع نہیں ہو سکتے۔ خلوص یہ ہے کہ دل و جگر کو جلانے کا کام کسی شہرت، عزت یا اور کسی فائدہ کی غرض سے نہ ہو۔ عمل میں

گہرائی اور گیرائی خلوص و جذبۂ صادق سے ہی ممکن ہے۔

(۲) شاعر کے پاس ایک پیام ہے۔ لیکن اس پیام کے لئے ماحول سازگار نہیں ہے۔ فضا کے اندر سرد مہری ہے۔

(۳) پیامبر کا پیام ہی گرمیٔ خلوص سے بیگانہ ہے، تو ماحول کی سرد مہری میں حرارت کی کیفیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ شاعر کا پیغام اہل محفل کے فائدہ کے لئے ہے۔ مگر فائدہ کی طلب اس کو ہو سکتی ہے جس کے دل میں کم سے کم احساس زیاں ہو۔

(۴) باوجودیکہ شاعر کا پیغام جن لوگوں کے نام ہے وہ ان خصوصیات سے معرّی ہو چکے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی شخصیتیں عام انسانی کردار سے ممیز تھیں۔ ان کے ولولے، جوش، عمل خیر کا جذبہ سب ختم ہو چکا پھر بھی ناامیدی کی ضرورت نہیں۔ ایسی ہی تاریک رات کے دامن سے صبح امید نمودار ہوتی ہے۔

(۵) اے شاعر کہ تو ساقیٔ میخانۂ حجاز ہے۔ تیرے رندوں سے غفلت کا پردہ ہٹ رہا ہے اور مئے مغرب کی بجائے بادۂ اسلام کو خود ہی طلب کرنے لگے ہیں ایسے وقت میں ضروری ہے کہ تو اپنے اندر وہ سوز پیدا کرے کہ خود اپنے وجود کو عشق (عشق دین اسلام) میں جلا ڈالے اور دوسروں کے اندر بھی وہی سوزانی کیفیت پیدا کر سکے۔

(۶) تیرے اندر عیش پرستی کی کیفیت پیدا ہے، تیری جمعیت ملّی، تفریق باہمی کی وجہ سے منتشر ہو چکی ہے۔ ہمّتِ عالی کی ضرورت ہے اور ربط و ضبطِ

سے ہی نشأۃ ثانیہ ممکن ہے۔

(۷) اپنے اندر جذب دلی پیدا کر اور اپنی نواؤں سے اہل چمن کے دل میں شور مستی پیدا کر دے۔

(۸) دین اسلام آخری پیغام ہے جس کا تو علمبردار ہے، تو ہی رہبر، رہنما اور رہرو کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ پر قائم ہو جا باطل سے نظر پھیر کر حق پر ثابت قدم ہو جا۔

(۹) مادی کمی اور کوتاہی سے شکستہ دل نہیں ہونا چاہیئے۔ تیرے پاس خدائی پیغام ہے، جس کے ذریعہ ہفت کشور کو بے تیغ و تفنگ فتح کرنا ممکن ہے۔ قدر شناسی کی ضرورت ہے۔ جس طرح میں (شمع) اپنی ہستی کو آتش نوائی سے پھونک ڈالتی ہوں اسی آتش نوائی کے ذریعہ ملی زندگی میں تم بیداری پیدا کر سکتے ہو اور پیغام حق کے ذریعہ تسخیر کائنات کر سکتے ہو۔

(۱۰) وہ دن عنقریب آنے والا ہے جبکہ تمہارے دین کا بول بالا ہوگا اور آج جو اغیار نے طوفان اٹھا رکھا ہے، وہ دب جائے گا۔ یہ ایک مستقبل کی پیشین گوئی ہے، جو ضرور پوری ہو کر رہے گی۔

اس نظم کے اندر شاعر کے دل کا اضطراب نمایاں ہے۔ ایسی ہی نظموں کی بدولت شاعر کا درجہ پیغمبر کا درجہ قرار پاتا ہے اور یہی وہ جوہر ہے جس کے فقدان نے حالی و سرسید احمد کو غلط راہ پر ڈال دیا۔ شاعر نے آئندہ نظموں میں بخوبی وضاحت کر دی ہے اور یہاں پر بھی اس کا حوالہ ہے، وہ یہ کہ مغربی نظام تعلیم نے اسلامی کردار سے جذبۂ حریت اور شوق شہادت کو فنا کر دیا:

ع
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ اِلّا اللہ

انیسویں بیسویں صدی کے مصلحین کے سامنے ملّی زندگی کی اصلاح اگر مقصود تھی، تو اسی قدر کہ اہلِ اسلام معاش و علم سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی روحانی زندگی کا کیا ہو؟ اس کی طرف ان کی قطعی توجہ نہ تھی۔ شمع و شاعر وہ سب سے پہلی نظم ہے، جس میں شاعر پختگی کی معراج حاصل کرتا ہے اسے اپنی نواؤں کا مقصود معلوم ہوتا ہے اور یہ یقین بھی کہ ایک نہ ایک دن اس کی آواز جس کی طرف ابھی دھیان نہیں دیا جاتا بخوبی گونج جائے گی اور ملّی زندگی میں بیداری کی لہر پیدا ہو جائے گی۔

علّامہ اقبال کے بارے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ علّامہ نہ دنیا دارانہ سیاست کے قائل تھے اور نہ سرسید کے مشن کے ہمنوا۔ ہاں اقبال کا عہد علی گڈھ تحریک کے بعد کا عہد ہے اس لئے وہ ان کی تحریک کی مخالفت یا موافقت میں شامل نہ ہو سکے۔ یہاں اس نظم کو نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تاکہ ان لوگوں کے دماغ سے یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اقبال، حالی اور اکبر کے تتمہ تھے۔ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا ہے کہ اقبال اگر تتمہ تھے، تو حضرت مجدد کے اقبال ہرگز تالیف پسندوں سے جو مغرب اور اسلام کا امتزاج چاہتے تھے۔ کوئی مصالحت نہیں کر سکتے تھے۔

(۲۵) فردوس میں ایک مکالمہ

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدیِ شیراز

اے آنکہ ز نورِ گہرِ نظمِ فلک تاب
دامن بہ چراغِ مہ و اختر زدہ باز

کچھ کیفیتِ مسلمِ ہندی تو بیاں کر
واماندۂ منزل ہے کہ مصروفِ تگ و تاز

مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اسکی رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیِ آواز

باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا اُلٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہے اگر ساز

بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز

پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہ ذکر حضورِ شہِ یثرب میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نہ نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

ترجمہ

ہماری بوئی ہوئی جھاڑی سے خرما حاصل نہیں ہو سکتا
ہمارے کاتے ہوئے اُون سے دیبا نہیں بُنا جا سکتا

(۲۶) مذہب

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی؟

اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(۲۷) پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ!
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ!

خضرِ راہ

تلمیحات:۔ خضر کے معنی سبز کے ہوتے ہیں۔ فکرِ انسانی نے دائمی زندگی کے بارے میں سوچا تو اسے گمان ہوا کہ کہیں آبِ حیات یا چشمۂ حیوان

ضرور ہوگا جس کا پانی پی کر انسان امر ہو سکتا ہوگا ۔ دنیا کی ہر قوم کی اساطیر میں یہ مذکور ہے کہ ایک شخص ایسے پانی کا (خواہ وہ مان سرور ہو ACQUA VITAE ہو یا آبحیات ہو) ایک گھونٹ پی کر سرسبز ہو گیا اور دائمی زندگی پا گیا ۔ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھولے بھٹکوں کی رہنمائی میں لگا رہتا ہے ۔

خضر راہ میں خضر نام دیدیا گیا ہے اس بندۂ خدا کا جس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے فرمان الٰہی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ربوبیت کی اولین تربیت کے لئے انہیں مخصوص بندہ خدا سے مجمع البحرین (دو سمندروں کے سنگم پر) ملیں ۔ وہ بندۂ خدا کون تھے ۔ اس کی تشریح نہیں ملتی ۔ قرین قیاس یہی ہے کہ فرمان غیبی سے کوئی فرشتہ ہی اس کام کے لئے مامور ہوں گے عجمیوں کے نزدیک چونکہ ان کا ذہن اساطیر و قصص سے متاثر تھا ۔ اس بندہ خدا کو خضر قرار دیا گیا ۔ شاعر نے بھی اسی مخصوص بندہ کو خضر قرار دیا ہے اور اس نظم میں خضر کی انہیں صفات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو مشہور عام ہیں ۔

باقی تلمیحوں کو نظم کے آخر میں دیکھو ۔

(۲۸) الف خضر راہ

شاعر

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر گوشۂ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا گرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
"کشتیٔ مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش

زندگی کا راز ہے کیا، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ[1] اسکندر رہا محروم آب زندگی
فطرت اسکندری[2] اب تک ہے گرم ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ!
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

---

[1] مشہور لطیفہ ہے کہ حضرت خضر اور سکندر دونوں آبحیات کی تلاش میں نکلے تھے۔ خضر کو کامیابی ہوئی اور سکندر کو ناکامی۔ [2] جنگ طرابلس کی بنیاد یہی تھی کہ اہل یورپ، یورپ اور مغربی ایشیا میں اسلامی سلطنت کے وجود کو بڑی نفرت کی نظر سے دیکھتے اور اسے یورپ کا مرد بیمار سمجھتے تھے۔ طرابلس کی جنگ میں آخری بار دولت عثمانیہ کو عظیم ترین نقصانات اٹھانے پڑے۔ تمام مسلمانان عالم کو ترکوں سے ہمدردی تھی۔ مگر اہل عرب نے ترکوں کو نہ صرف مدد دینے سے انکار کیا تھا بلکہ ان کی مخالفت بھی کی تھی۔

(۲۸) ب. جوابِ خضر

صحرانوردی[1]

کیا تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیلؑ
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

---

[1] جوابِ خضر میں صحرانوردی کے عنوان سے صحرا کی زندگی کا پورا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ہم اس کا مقابلہ اقبال کی بالیدہ تر نظم ذوق و شوق کے پہلے بند سے کر سکتے ہیں۔

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریٔ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگی (۲۸) ج

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے
خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفر
رات کے تاروں میں اپنا رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

(۲۸) سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ انّ الملوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل[1] آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

غلامی سے اپنی آزاد فطرت کو رسوا نہ کر جتنے آقا پیدا کرتا جائے گا اتنا ہی برہمن سے بدتر کافر ہوتا جائے گا۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دنوں کے لئے طورِ سینا پر تشریف لے گئے تو وہی بنو اسرائیل جنہیں فرعون کی مصیبتوں سے نجات ملی تھی اور خدا کے بے شمار کرم دلنوازش سے نوازے جا چکے تھے سامری جادوگر کے فریب میں آ کر ایک پیتل کا بچھڑا پوجنے لگے اور اسی چالیس دن کے عرصہ میں ہر طرح کے گناہ اور لذتیت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ جب واپس آئے تو انہیں سخت غصہ آیا انہوں نے سامری کے طلسم کو توڑ دیا سارا طلسم جل کر بھسم ہو گیا۔ ایک بار پھر توحید کے رشتہ میں بنو اسرائیل جڑ گئے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

۲۸) سرمایہ محنت

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحرالموط[1] نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات

۱؎ کوہ الموط یا الموت پر زنگیوں نے فرضی جنت بنائی تھی اس کے حاکم اعلیٰ کو شیخ الجبال کہا جاتا تھا۔ اقبال اسے ساحرالموط کہتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کو بھانگ کی پتی (برگ حشیش) کا شربت پلاتے اور اسے بیہوشی کے عالم میں مصنوعی جنت میں پہنچا دیتے۔ وہاں کی نعمتوں کو دیکھ کر بیچارے ششدر رہ جاتے پھر بھانگ کی پتی ہی پلا کر بے خود کرتے اور اسے اس کے مقام اصلی پر پہنچا دیتے! ایسے آدمی سے وعدہ ہوتا کہ فلاں فلاں آدمیوں کی اطاعت کرو اور ان کے احکام میں چون و چرا نہ کرو تو مرنے کے بعد اسی جنت میں جگہ ملیگی۔ اسی طرح لاکھوں کروڑوں فدائی پیدا ہو گئے تھے جو شیخ الجبال کے اشاروں پر ناچتے تھے۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

(۲۸) دُنیائے اِسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ[1]
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

---

[1] تثلیث کے فرزند = عیسائی۔ عیسائی مشنریوں نے خدمتِ خلق کا کام اسی طرح اپنے ذمہ لیا جس طرح مسلمانوں کا شیوہ تھا۔ میراثِ خلیل = اسلام خلیل حضرت ابراہیم کو کہتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد ملتِ ابراہیمی پر قائم ہے۔

ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس — وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے، تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی[1] ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — حق ترا چشمے عطا کردست غافل در نگر
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست — مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو — ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار — لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش[2]
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

---

[1] رومی نے کہا ہے کہ جب کسی بنیاد کو از سرِ نو آباد کرتے ہیں تو پہلے اول بنیاد کو ڈھا کر مسمار کر لیتے ہیں۔

[2] اگر تم کو پوشیدہ کی حقیقت نہیں معلوم تو ظاہری باتوں پر بھی ہشیاری سے نظر کرو ابوبکرؓ اور علیؓ کے شیدائیو (سنیو اور شیعو) ہشیاری سے کام لو یعنی اختلاف سے پرہیز کرو۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار[1]
ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

---

[1] مسلمان ہو اس لئے اپنے سینے میں امید کی گنجائش رکھو۔ ہمیشہ خیال رکھو کہ خدا کا فرمان ہے کہ وہ وعدوں کو پورا کرتا ہی ہے۔

تلمیحات۔ کشتیٔ مسکین و جان پاک و دیوار یتیم :۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چار باتوں کی تلقین مقصود تھی کیونکہ نبوت کا بار سونپا جا رہا تھا۔ ایسی تربیتیں ہر پیغمبر کے ساتھ عام رہی ہیں بلکہ کبھی آزمائشوں میں ڈال کر ان کے ارادے میں استحکام اور عمل میں بے لوثی کی تربیت کی گئی ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی سے آزمایا گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ڈال کر اور حضرت ایوب علیہ السلام کو آفات مرضی میں مبتلا کر کے جانچا گیا۔ حضور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدمت نبوت سونپے جانے سے پہلے شرح صدر کیا گیا۔

بہر حال مجمع البحرین پر اپنے ایک ہمسفر کے ساتھ وہ ایک مرد خدا سے ملے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے مصاحبت کی اجازت چاہی ارشاد ہوا تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمنائے دلی ظاہر کی اور امید ظاہر کی کہ انشاءاللہ وہ صبر و سکون کے ساتھ ان کا ساتھ دیں گے۔ چار باتوں کی تلقین مقصود تھی۔ (۱) انسانی علم نہایت مختصر ہے جیسا کہ دو سمندروں کے اتھاہ پانی سے ایک قطرہ کی نسبت ہے ویسا ہی حقیقت مطلقہ (خداوند قدوس) کے علم اور انسان کے علم کا تناسب ہے۔

(۲) انسانی علم کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ الہامی علم کی توجیہہ کر سکے مگر انجام کار الہامی علم میں ہی تمام تر فائدہ ہے

(۳) احکام الہیٰ کبھی بظاہر غضب و قہر معلوم ہوتے ہیں مگر در حقیقت وہ حیات انسانی کے مفاد کے مطابق ہیں۔

(۴) کارِ نبوت یا عمل فی سبیل اللہ اپنے ذاتی غرض اور فائدے سے بے نیاز ہے۔ پیغمبر کا کام ہے اپنے دکھ پہنچانے والوں کو بھی موقع ہو تو سکھ پہنچانا۔

یہ باتیں اس طرح وقوع میں آتی ہیں۔

اللہ کے مخصوص بندہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ کشتی والے نے بغیر اجرت از راہِ احسان دونوں بزرگوں کو کشتی پر بٹھایا تھا۔ ایک چڑیا اڑتی ہوئی پانی کی سطح پر پہونچتی ہے اور چونچ کو پانی میں بھگو کر اڑ جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ذاتِ الٰہی کا علم سمندروں کے اتھاہ پانی کی طرح ہے اور ہمارا علم اس قدر ہے جتنا کہ اس چڑیا کی چونچ میں پانی ہے۔ کشتی ایک مقام پر رُکی دونوں بزرگ اترے لیکن مخصوص بندۂ خدا (خضرؑ) نے کشتی کے چند تختے توڑ دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ٹوکا لازم تو یہ تھا کہ ہم اس کے احسان کا بدلہ احسان سے دیتے یہ کیا آپ نے اس کی نئی کشتی کو بگاڑ دیا۔ ارشاد ہوا۔ "کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر و گے۔" خشکی پر چلتے ہوئے بندۂ خدا (خضرؑ) نے ایک بچہ کو قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ یہ کیا آپ نے ناحق خون کیا۔ ارشاد ہوا" کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے۔" دونوں بزرگ ایک آبادی میں داخل ہوئے آبادی والوں نے انہیں ستایا۔ نہ ٹھہرنے کی کہیں اجازت دی اور نہ کھانے پینے ہی دیا۔ ہر آدمی انتہائی بے مروتی سے پیش آیا۔ مجبوراً طے پایا کہ اس آبادی سے باہر نکل چلا جائے۔ راستہ میں ایک دیوار گرتی ہوئی دکھائی دی۔ بندۂ مخصوص نے اپنی کوشش سے اس دیوار کو درست

کر دیا اور گرنے سے بچا لیا۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا آپ نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ایسے بے مروت لوگوں کے ساتھ احسان نہیں کرنا چاہیے تھا جنہوں نے ہم پر طرح طرح کی اذیتیں بلا وجہ روا رکھیں۔ اگر آپ کو کچھ بھلائی کرنی ہی تھی تو ان سے اجرت طلب کر لیتے۔ ارشاد ہوا "اب تو میرے اور تیرے درمیان علیحدگی ہوتی ہے"۔

پھر تینوں باتوں کی وضاحت کی گئی:۔

(۱) کشتی مسکین کا معاملہ تو یہ ہے کہ ملاح ایک ایسے بندرگاہ پر جا کر رکنے والا ہے جہاں کا حاکم ظالم ہے وہ نئی کشتیاں ضبط کر لیا کرتا ہے اور اسے اپنی ریاست کی ملکیت قرار دیتا ہے۔ چونکہ اس کشتی والے کی کشتی بھی نئی ہے اس لئے ضبط ہونا لازمی ہے۔ میں نے چند تختے اکھیڑ دیئے اب اس بندرگاہ کے حاکم کے ملازمین اس کشتی کو پرانی کشتی سمجھیں گے اور ضبط نہ کریں گے۔ اس کا کیا چند کیلیں اکھڑی ہیں وہ انہیں ٹھونک کر درست کر لے گا۔

(۲) جس بچہ کو میں نے قتل کیا اس کا سبب یہ تھا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہتا تو تمام فتنہ و فساد اس کے دم سے سرزد ہوتے حالانکہ وہ جس خاندان کا چشم و چراغ تھا وہ نہایت صالح اور بااقتدار لوگوں کا خاندان ہے۔ یہ قتل ایک بچہ کا قتل نہ تھا بلکہ زمانۂ مستقبل کے فتنہ و فساد کا قلع قمع کرنا مقصود تھا۔

جس دیوار کو درست کیا گیا اور گرنے سے بچایا گیا وہ دیوار دو

یتیم بھائیوں کی ہے۔ دیوار کے اندر ایک خزانہ ہے۔ اگر دیوار ابھی گر گئی ہوتی تو ظالم لوگ ان بچوں کی ملکیت کو ہڑپ کر جاتے۔ اب آئندہ دیوار گرے گی تو یہ دونوں بالغ ہو چکیں گے۔ اور اپنے مال کی حفاظت کر لیں گے۔ اللہ کی راہ میں چلنے والے صرف بھلائی کرتے اور اجرت صرف اللہ ہی سے چاہتے ہیں۔ مزید براں اپنی ذاتی اذیتوں اور مصیبتوں سے بے پرواہ رہتے ہیں۔ کشتی والے معاملہ سے ظاہر ہے کہ صورتِ حال کے پیشِ نظر عقل سوچتی ہے کہ کشتی والوں کا نقصان ہوا مگر حال اور مستقبل کا رشتہ جوڑا جائے تو کشتی والے سراسر فائدہ میں رہے۔ یہی حال پیغمبروں کی الہامی تعلیم کا ہے۔ کہ بظاہر دنیاوی نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے مگر جو کوئی خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے وہ عظیم ترین کامیابی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح بچہ کو عقل معصوم سمجھتی ہے۔ بچہ کا قتل کسی معصوم کا قتل ہے لیکن عقل کی بینائی محدود ہے اور روحانی عرفان کا دائرہ لامحدود ہے فتنہ کے سب سے پہلے سوراخ کو نہ بند کیا گیا تو وہ بندھ کو توڑ کر سیلاب کی طرح امنڈ آئے گا اور تمام عالمِ وجود کو اپنے شر سے تہہ و بالا کر دے گا۔

(۲۹) انسان اور بزمِ قدرت

صبحِ خورشیدِ درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزمِ معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتوِ مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا
سیمِ سیال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی، درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مئے گل رنگ خم شام میں تو نے ڈالی

رتبہ تیرا ہے بڑا شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
زیر خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بام گردوں سے و یا صحن زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود

انجمن حسن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں
عشق کا ہے تو صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

مرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار مجھ سے جو نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے

نور خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منت خورشید چمک ہے تیری

ہو نہ خورشید تو ویراں ہے گلستاں میرا
منزل عیش کی جا، نام ہو زنداں میرا

آہ! اے راز نہاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دام تمنا میں الجھنے والے

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

(۳۰) نوائے غم

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش — جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار — جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت — اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ! امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ مضراب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی

مگر آتی ہے نسیمِ چمن طور کبھی — سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی
چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات — جس سے ہوتی ہے رہا روحِ گرفتار کبھی
نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے — اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری رفعت کی بلندی ہے نوائے غم سے

(۳۱) گورستانِ شاہی

آسماں، بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے — کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں — صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی — بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطن ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آہ! جولاں گاہِ عالمگیر، یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سینکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں
ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں
خاکبازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اسے
داستاں ناکامیِ انساں کی ہے ازبر اسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا
آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا

رنگ و آبِ زندگی سے گل بداماں ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدۂ عبرت، خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا
ہے تو گورستان مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا
درد مندانِ جہاں کا نالۂ شبگیر کیا

عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

روح مشتِ خاک میں زحمت کشِ بیداد ہے
کوچہ گردِ نے ہوا جس دم نفس، فریاد ہے

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا، کوئی دم چہچہایا، اڑ گیا

آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار

اے ہوس خوں رو، کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار

چاند جو صورت گرِ ہستی کا اک اعجاز ہے
پہنے سیمابی قبا محوِ خرامِ ناز ہے

چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر
بے کسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار

ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادر گیتی رہی آبستن اقوام نو (۱)

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگزر
چشم کوہ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں
دفتر ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہر ایراں کو اجل کی شام نے
عظمت یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یوں ہی رخصت ہوا
آسماں سے ابر آزاری اٹھا برسا گیا

ہے رگ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

سینۂ دریا شعاعوں کے لئے گہوارہ ہے
کس قدر پیارا لب جو مہر کا نظارہ ہے

محو زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہے
غنچۂ گل کے لئے باد بہار آئینہ ہے

نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانہ میں
چشم انساں سے نہاں پتوں کے عزلت خانہ میں

اور بلبل مطرب رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادی کہسار میں نعرے شبان زادوں کے ہیں

---

(۱) اقبال تصوف میں پیر رومی کی اتباع کرتے ہیں اسی طرح جب کسی تاریخی حقیقت پر کوئی کلی حکم لگاتے ہیں تو مرحوم علامہ ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کی پیروی کرتے ہیں۔ مثنوی معنوی کے ساتھ ساتھ مقدمہ ابن خلدون کی اہمیت کو بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے — موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دست طفل خفتہ سے گرتے کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یاد عہد رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در — گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیٔ گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

(۳۲) فلسفۂ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور کے نام)

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی — اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی — ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں — نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ 'یارب' نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی ایک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو گویا وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ منزل ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہوں اندھیری رات میں

(۳۳) والدہ مرحومہ کی یاد میں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجام غنچہ کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پائندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے روح کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جسکی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تیری تصویر، وہ بازو مرا

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں

اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی ہیں پسِ نُہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں سبز کر دے گی انھیں بادِ بہارِ جاوداں

خفتہ خاکِ پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں

ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یوں سمجھو اجل کچھ بھی نہیں جسطرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ غافل موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے نفس کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب موجِ مضطر توڑ کر کرتی ہے تعمیرِ حیات

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ سیمابِ پریشاں، انجمِ گردوں فروز شوخ یہ چنگاریاں ممنونِ شب ہے جن کا سوز

عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے سرگذشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر قدسیوں سے بھی مقاصد میں جو ہے پاکیزہ تر

جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے　　آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہے　　جس کا ناخن ساز ہستی کے لئے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے　　کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانہ میں جو مستور ہے　　خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں　　خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ　　موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند　　ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردہ میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں　　موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
کہنے میں اہل جہاں درد اجل ہے لا دوا　　زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں　　وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں　　اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے　　خون دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے
آدمی تاب شکیبائی سے گو محروم ہے　　اس کی فطرت میں یہ اک احساس نامعلوم ہے
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں　　آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
رخصت ہستی خاک غم کی شعلہ افشانی سے ہے　　سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ؟ یہ ضبط فغاں غفلت کی خاموشی نہیں

آگہی ہے یہ دل آسائی فراموشی نہیں

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح — داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ — بے نوا طائر کو مست ہر نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے — سینکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آزاد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کہسار و رود بار — ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دام سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر — کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر
یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے — جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات — جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات
مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے — آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے
ہے وہاں کے حاصلِ کشتِ اجل کے واسطے — سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے
نور فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں — تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر — خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(۳۴) اسیری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک ہو جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ ور

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

(۳۵) طلوعِ اسلام

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرہ ذرہ کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے ۔۔۔ یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را ۔۔۔ صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے! ۔۔۔ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ۔۔۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے ۔۔۔ کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینہ میں پوشیدہ ہے رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے ۔۔۔ یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ۔۔۔ ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا ۔۔۔ خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی ۔۔۔ جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

یہ نکتہ سرگذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا ۔۔۔ کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی ۔۔۔ اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا ۔۔۔ نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک ۔۔۔ ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی

گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا ۔۔۔ بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے ۔۔۔ وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے — تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا

تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے

دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے — ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے — طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہگزر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو — جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا — خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے — جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے — یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں ۔۔۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی صورت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا ۔۔۔ خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو ۔۔۔ اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی ۔۔۔ تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسل ہیں بال و پر تیرے ۔۔۔ تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے ۔۔۔ نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر ۔۔۔ شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے ۔۔۔ گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے ۔۔۔ قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو ۔۔۔ ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا ۔۔۔ جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۔۔۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچہ کی وا کر دے ۔۔۔ کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی ۔۔۔ زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد، نگار آمد قرار آمد
کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیل از خونِ ما نمناک می گردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد
سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

فارسی اشعار کا ترجمہ:۔

چہ باید مرد را طبعِ بلندے ....

مرد کو کیا ضروری ہے؟ ایک بلند طبیعت، خالص شراب، سرگرم دل، پاک بیں نگاہ اور بیتاب روح۔

بیا پیدا خریدار است ......

آؤ کہ ایک ناتواں جان کا خریدار ظاہر ہوا ہے۔ بڑی مدت کے بعد ہمارے پاس سے ایک کارواں کی گذر ہوئی ہے (عام طور پر گذرنے والے کارواں ایسی جگہوں سے جہاں مخصوص اشیاء وافر اور کم نرخ میں

ملتی تھیں انہیں خریدتے اور دوسری جگہوں سے خریدی ہوئی گراں چیزیں ان کے ہاتھوں فروخت کرتے تھے۔ اہلِ ایشیا کسی صاحب دل کی تلاش میں ہیں ان کا کارواں لغائے عاشقانہ کا طلبگار ہے۔ شاعر کی خوش نصیبی ہے کہ ایک مدت کے بعد اس کی جانِ ناتواں (جذبہ و افکار دینی کی قدر ہونے والی ہے)

بیا ساقی نا الخ

ساقی آکہ سبزہ زار کے نغمے گلزاروں میں سنائی دینے لگے۔ بہار آئی ہے اس کے ساتھ محبوب آیا ہے اور محبوب کی وجہ سے دل کو قرار حاصل ہوا ہے۔

ابر بہاری نے وادی و صحرا میں خیمہ ڈال دیا ہے۔ جھرنوں کے پانی کے گرنے کی آواز پہاڑی کی بلندی سے آرہی ہے۔

اے ساقی میں تیرے قربان جاؤں اگلے لوگوں کے اصول موسیقی کے مطابق ساز چھیڑ دے کیونکہ گویوں کی جماعت قطار در قطار چلی آرہی ہے۔

زاہدوں سے علیحدگی اختیار کرلے اور نڈر ہو کر شراب پی کہ اس پرانی شاخ سے بڑی مدت کے بعد بلبل کے نغمے سنائی دیئے۔

عاشقوں کو بدر و حنین کے مالک کے قصے سناؤ کہ ان کے پوشیدہ تصرفات (قدرت و اختیار الہٰی کہ اللہ والا خدا کا ہاتھ، خدا کا ارادہ اور خدا کی قدرت ہوتا ہے) میری نظر میں ظاہر دکھائی دے رہے ہیں۔

پھر شاخ خلیل (دین اسلام) ہمارے خون سے سیراب ہوگئی۔

محبت کے بازار میں میرے سکّے پورے طور پر کھرے اترے۔

میں ایک ایسے شہید کی خاک پر لالہ کی پنکھڑیاں بکھیر دوں جس کا خون ہماری ملت کے درخت کی سینچائی کے قابل ہوا ہے۔

آؤ تاکہ پھول جھاڑیں، اور شراب کو ساغر میں انڈیلیں۔ آسمان کی چھت توڑ دیں اور نئی بنیاد قائم کریں۔

(یہ ذہن نشیں رہے کہ اقبال کو خواجہ حافظ کے خیالات سے اختلاف ہے مگر عجیب اتفاق کہ وہ خواجہ کی ہی زبان واصطلاح کی فارسی شاعری میں پیروی کرتے ہیں۔ آخری شعر خواجہ حافظ کی ایک غزل کا مطلع ہے)

(۳۶) رفتگان خاک سے استفسار

(رازہائے بعد الموت)

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقاب روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام

یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے

کر رہا ہے آسماں جادو لب گفتار پر
ساحر شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر

غوطہ زن دریائے خاموشی میں ہے موجِ ہوا
ہاں مگر اک دور سے آتی ہے آوازِ درا

دل کہ ہے بیتابیٔ الفت میں دنیا سے نفور
کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور

منظر حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشیں خفتگان کنج تنہائی ہوں میں

تھم ذرا بیتابیٔ دل بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے

اے مے غفلت کے سر مستو کہاں رہتے ہو تم
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی
اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی

آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا

یاں تو اک مصرع میں نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل

واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا

رشتہ و پیوند یاں کے جان کا آزار ہیں
اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں

اس جہاں میں اک مشیت اور سو افتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے

کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں اندیشۂ رہزن بھی ہیں

تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے
خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا
امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا

واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں
اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے
یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے
موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے

اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے

دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

(۳۷) تضمین بر شعرِ صائبؔ (خودی کی پرورش دشت و در میں ہی ممکن ہے)

کہاں اقبالؔ تو نے آ بنایا آشیاں اپنا
نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی

شرارے وادیٔ ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی

کلی زورِ نفس سے بھی وہاں گل ہو نہیں سکتی
جہاں ہر شے ہو محرومِ تقاضائے خود افزائی

قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہلِ گلستاں کی
نہ ہے بیدار دل پیری نہ ہمت خواہ برنائی

دلِ آگاہ جب خوابیدہ ہو جاتے ہیں سینوں میں
نوا گر کے لئے زہراب ہوتی ہے شکر خائی

نہیں ضبطِ نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستاں سے
کہ اس محفل سے خوشتر ہے کسی صحرا کی تنہائی

ہماں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تابِ حسنِ صحرائی

(۳۸) گلِ پژمردہ (بے ثباتیٔ عالم)

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھکو گل کہوں
کس طرح تجھکو تمنائے دلِ بلبل کہوں

تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا

تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی ہے جس کی ہے تعبیر تو

ہمچو نے از نیستاں خود حکایت می کنم
بشنو اے گل از جدائیہا شکایت می کنم

(۳۹) طفل شیر خوار (تلون مزاجی)

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم
آہ، کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھکو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے
گیند ہے تیری کہاں، چینی کی بلی ہے کدھر
وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر
تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو
ہاتھ کی جنبش میں طرز دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے
زندگانی ہے تری آزاد قید امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز
جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو
آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
تو تلون آشنا میں بھی تلونِ آشنا
عارضی لذت کا شیدائی ہوں چلاتا ہوں میں
جلد آجاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں
میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسن ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری
تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفل ناداں میں بھی ہوں

(۴۰) ایک پرندہ اور جگنو (توافق طبقا)

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ پیرا — کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر — اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر

کہا جگنو نے اے مرغِ نواریز — نہ کر بے کس پہ منقارِ ہوس تیز
تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی — اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباسِ نور میں مستور ہوں میں — پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری بہشتِ گوش اگر ہے — چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی — تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا — مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز — جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیامِ بزمِ ہستی ہے انہیں سے — ظہورِ اوج و پستی ہے انہیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

بانگِ درا کی چند غزلیں

مربوط غزلیں

دل

(۱)

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل

یا رب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب
جل گیا مزرعِ ہستی تو اگا دانۂ دل

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانۂ دل

تو تو سمجھا نہیں اے زاہدِ ناداں اسکو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے
وہ اثر رکھتی ہے خاکسترِ پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

(۲) ساقی

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

(۳) میں اور تو

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری
مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم، گرو عجم، ترا دیں خریدۂ کافری

دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی
غم رم نہ کر، سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

کوئی ایسی طرز طواف تو مجھے اے چراغ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشت سمندری

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

عام غزلیں

(۴)

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کیلئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کیلئے

وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کیلئے

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری
ایک پیماد ترا سارے زمانے کیلئے

دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کیلئے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو
آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کیلئے

پاس تھا ناکامی صیاد کا اے ہم صفیر!
ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانے کیلئے

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کیلئے

(۵)

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا
اور اسیر حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا

جائے حیرت ہے بُرا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا

کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر!
کیا خبر ہے تجھکو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا

ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا
مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا

دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
پھر یہ وعدہ حشر کا صبر آزما کیونکر ہوا

حُسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب!
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا

موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے درد فراق
چارہ گر دیوانہ ہے، میں لا دوا کیونکر ہوا

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا

تونے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا

(۶)

جنہیں میں ڈھونڈھتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلےٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کی گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے تھے
مگر گھڑیاں جدائی کی گذرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چھپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی نازآفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہ نارسا جن کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَاعَرَفْنَا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں
خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں
برا سمجھوں انہیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبالؔ اپنے نکتہ چینوں میں

(۷)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں ۔ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی ۔ کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو ۔ کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا ۔ وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل ۔ چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(۸)

کشادہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے ۔ نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ ۔ خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی ۔ جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے
مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا ۔ جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے ۔ جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے
سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے ۔ یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے
تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل ۔ جہاں میں وا نہ کوئی چشم امتیاز کرے
غرور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو ۔ کہ بندگان خدا پر زباں دراز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبار رہ حجاز کرے

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی (۹) ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لب گویا پیام موت اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی
چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشیں پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

(۱۰)

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
وہ مے کش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقی نامہرباں تک ہے
چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بیتابی جو میرے آشیاں تک ہے
وہ مشت خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے
جرس ہوں نالۂ خوابیدہ ہے میری رگ و پے میں
[illegible]

جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ میہماں تک ہے
زمانہ بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

(۱۱)

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاجِ دردمیں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

(۱۲)

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے
ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے ۔۔۔ اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار ۔۔۔ شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے ہیں مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

(۱۳)

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں
گل تبسم کہہ رہا تھا، زندگانی کو مگر
شمع بولی، گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
زائرین کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

(۱۴)

الٰہی عقل خجستہ پے کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے
اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پیرہن نہیں ہے
ملا محبت کا سوز مجھ کو تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو، تری کوئی انجمن نہیں ہے

یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیرِ چرخِ کہن نہیں ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیر مخزن سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

(۱۵)

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری
گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آرزو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

کھلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی غبار تھا کوئے آرزو کا

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نظر کو نظارہ کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا اتنا بیدرد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

تمام مضموں مرے پرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

سپاس شرط ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رخت سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں، تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

(۱۶)

چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، افتادگی تیری کنارے میں
شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوق تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں
جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں
مجھے پھونکا ہے سوز قطرۂ اشک محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں
نہیں جنس ثواب آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں
سکوں نا آشنا رہنا اسے سامان ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے آ بیٹھی ہے پارے میں
صدائے لن ترانی سن کے اے اقبالؔ میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

(۱۷)

یوں تو اے بزم جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

کس قدر اے مے! تجھے رسم حجاب آئی پسند
پردۂ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی
حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم
اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی
میں نے اے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

(۱۸)

مثال پرتو مے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم! تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
نیا جہاں کوئی اے شمع ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کش تپش ناتمام کرتے ہیں
بھلی ہے ہم نفسو! اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے شغل شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
کہ ہم تو رسم محبت کو عام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
جو بے نمازی کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبالؔ
بلا کے دیر سے مجھکو امام کرتے ہیں

(۱۹)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزاروں موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

---

(۲۰)

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

یہ موجِ پریشاں خاطر کو پیغام لبِ ساحل نے دیا
ہے دور وصالِ بحر ابھی، تو دریا میں گھبرا بھی گئی

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجابِ محمل سے
محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلا بھی گئی

کی ترکِ تگ و دو قطرے نے تو آبروئے گوہر بھی ملی
آوارگیٔ فطرت بھی گئی اور کشمکشِ دریا بھی گئی

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے، کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

(۲۱)

یہ سرودِ قمری و بلبل فریبِ گوش ہے
باطن ہنگامہ آبادِ چمن خاموش ہے

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے، ساری انجمن بے ہوش ہے

دہر کے غمخانے میں تیرا پتہ ملتا نہیں
جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے

آہ! دل دنیا سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں
پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

جس کے دم سے دلی و لاہور ہم پہلو ہوئے
آہ اے اقبال، وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

(۲۲)

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی — تو ہے زناریِ بت خانۂ ایام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی — ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات — تری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک — مرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب — مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

(۲۳)

پردہ چہرے سے اٹھا انجمن آرائی کر — چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر

تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کب تک — بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

نفسِ گرم کی تاثیر ہے اعجازِ حیات — ترے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

کب تلک طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم — اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

ہو تری خاک کے ہر ذرہ سے تعمیرِ حرم — دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا — ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

پہلے خوددار تو مانندِ سکندر ہو لے — پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

(۲۴)

پھر باد بہار آئی، اقبال غزلخواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو

تو خاک کی مٹھی ہے، اجزا کی حرارت سے
برہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاباں ہو

تو جنس محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کم مایہ ہیں سوداگر، اس دیس میں ارزاں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو

اے رہرو فرزانہ! رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گر ساماں ہو

(۲۵)

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوائے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیث گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں

نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(۲۶)

نہ دام کبھی غزل آشنا رہے طائرانِ چمن تو کیا

جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی

ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دلِ ناصبور نہ کر سکا

وہی گریۂ سحری رہا وہی آہ نیم شبی رہی

نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیب دیر و حرم رہے

نہ رہی کہیں اسد اللہی، نہ کہیں ابو لہبی رہی

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا

وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

(۲۷)

گرچہ تو زندانی اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر — آیۂ لا یخلف المیعاد رکھ

یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے

"اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ" یاد رکھ

اقبالؔ

حصّہ دوئم

پانچواں باب

معیاری نظمیں

بانگ درا کی نظموں اور غزلوں کے بعد اقبال کی بالیدہ تر نظموں اور غزلوں کا دور شروع ہوتا ہے اس میں شاعر نے فکری اور فنی طور پر کافی ترقی حاصل کر لی اور وہ حقیقی معنوں میں شاعر مشرق کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کا اردو حصہ یہ سب کچھ شاعری کی بالیدہ فکری کی نشاندہی کرتی ہیں۔ تاہم ان میں امتیازی فرق یہ ہے کہ بال جبریل کی شاعری کے مقابلہ میں ضرب کلیم کی نظمیں کچھ بوجھل معلوم ہوتی ہیں اور تقریباً روانی کا وہ درجہ بھی کھو دیتی ہیں جو بانگ درا میں پایا جاتا ہے۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ ضرب کلیم میں اعلیٰ افکار کو کاوش سخن کے ذریعہ کیف پرور اور سرور آگیں نہیں بنایا گیا۔ شاید بانگ درا کے زمانہ میں ہی شاعر نے یہ طے کر لیا تھا کہ غافل قوم کو بیدار کرنے کا عمل تلخ نوائی سے ہی ممکن ہے اس لئے

ذہن کو جھنجھوڑنے کا کام زیادہ اہم ہے بہ نسبت سلیقۂ گفتار کے۔ چنانچہ ضرب کلیم میں ہی تجربہ کیا گیا اور بالِ جبریل اور ارمغان حجاز میں وہی بالیدہ افکار تلخ اپنے مزاج کے اعتبار سے ہوں گے۔ مگر قاری اور سامع کے سمع و بصر پر حاوی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ضرب کلیم میں شاعر نے خود نظموں کو پانچ حصہ میں ترتیب دیا ہے۔

(۱) اسلام اور مسلمان = اس عنوان کے ماتحت مختلف نظمیں ہیں جو مجموعی طور پر اسلام اور مسلمان کا تعارف پیش کرتی ہیں۔ اس سے مندرجہ ذیل باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:۔

عالم کی ظلمتیں بندۂ مومن کی اذان سے دور ہوتی ہیں۔ اذان نعرۂ تکبیر ہے جس میں سارے خداؤں کی نفی کرکے خدائے واحد کا اقرار کیا جاتا ہے۔ یہ نفی اس بات کی تائید ہے کہ انسان یہ تسلیم کرلے کہ دنیا اور دنیا کے لوازمات، دولت، غرور، سود و زیاں، رشتہ، مندی، پابندئ زمان و مکان غرض سب کچھ لاشئ اور غیر حقیقی ہیں۔ حقیقی ذات خدا کی ہے۔ جب مردِ مومن کے دل میں یہ یقین جاگزیں ہوجاتا ہے تو اس کی تیغ خودی فاتح کائنات و ماورائے کائنات ہوجاتی ہے۔

اقبال اسلام کا دوسرا نام فقرِ غیور قرار دیتے ہیں۔ جب کوئی فرد یا جماعت فقر کے اوصاف سے متصف ہولیتی ہے تو باطل کے خلاف صف آرا ہوجاتی ہے۔ فقر کو ظاہری اسباب کی ضرورت نہیں کیونکہ

خودی کی قاہری ہی فقر ہے اسے ہی قرآنی اصطلاح میں سلطان (وہ انتہائی قوت جو زمان و مکاں پر حاوی ہو سکتی ہے) کہا گیا ہے۔ اس فقر کی حفاظت میں آزادی کی حفاظت ہے۔ جن لوگوں نے تصوف سے رہبانیت مراد لیا ہے وہ غلطی پر ہیں ان کی جگہ اسلام کے اندر نہیں مسلمان تو وہی مرد مجاہد ہے ع

ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اسلام اور اسلامی نظریات، فلسفہ نہیں حقائق زندگی ہیں۔ یہ ایسے اعمال کا مظاہرہ ہیں جس سے کائنات کی تاریکی دور ہوتی اور عالم نورانی ہو جاتا ہے۔

مردِ مجاہد یا مردِ مومن تقدیر پر بھروسہ کر کے عمل سے غافل نہیں بیٹھتا۔ وہ فقر کی سلطانی سے گردش شام و سحر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے مومن احکام الٰہی کی پابندی کرتا ہے اور تقدیر مومن کے ارادوں کی پابندی کرتی ہے۔

دوسرا حصہ تعلیم و تربیت سے متعلق ہے۔ یہ بات شروع میں ہی واضح کر دی گئی ہے کہ اقبال کو اس تعلیم سے جو فکر معاش دیکر خود اعتمادی کی دولت سے محروم کر دیتی ہے، اختلاف ہے۔ تعلیم اور فکر معاش کا چکر ہی سر سید اور حالی کے مشن کا محرک تھا۔ اس تعلیم نے ہندوستانی نوجوانوں سے رہی سہی روح حیات بھی چھین لی۔ وہ اس علم کی تلاش میں ہیں جو سِرِ کلیمی سے روشناس کرتا اور آتش عشق کو بھڑکاتا ہے

تربیت اسے سمجھتے ہیں جو خودی میں زندگی اور بیداری کی صلاحیت عطا کرتی ہو۔ خودی اگر زندہ نہیں ہے تو آزادی کا حوصلہ ممکن نہیں ہے اور جو آزادی کے جوہر سے محروم ہے اس کی رسائی علم کے بجائے توہمات تک ہی ہوتی ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام میں خرد کی تربیت ہوتی ہے۔ مگر روح تشنہ رہ جاتی ہے۔ مشرقی تربیت گاہیں مغرب کی تقلید میں قائم ہوئی ہیں۔ مغربی تربیت گاہوں کی خصوصیت لادینی افکار اور بے ربطئ افکار ہے۔ اس کی تعلیم میں تشکیک و تذبذب بجائے علم و یقین غالب ہے۔ اس لیے ایسی تعلیم میں کشاکش حیات سے برد آزما ہونے کا وصف کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

تیسرا حصہ عورت سے متعلق ہے اس میں امومت کے فلسفہ پر زور دیا گیا ہے مگر نہ جانے کیوں ضرب کلیم میں وہ صفائی بیان نہیں جو رموز بیخودی میں ہم پاتے ہیں۔ رموز بیخودی کے اس حصہ کا آزاد ترجمہ یہاں پر نقل کر دیا جاتا ہے۔

عورت کی زخمہ زنی سے ساز مرد سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ عورت کی نیاز مندی سے مرد کا ناز دوبالا ہو جاتا ہے۔

عورت مرد کی عریانی کا لباس ہے اس کا دلبر حسن عشق کا پیراہن ہے۔

خدا کا عشق اس کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔ یہ گیت اس کا خاموش نغمہ ہے۔

جو مسلمان عورت کو کنیز سمجھتا ہے وہ تعلیمات قرآنی سے گویا بے بہرہ ہے۔

غور سے دیکھو کہ امومت (ماں بننے کا وصف) رحمت ہے کیونکہ اس کی نسبت نبیوں سے ہے۔

اس کا پیار پیغمبروں کا پیار ہے۔ وہ قوموں کے اندر سیرتوں کو پیدا کرتی ہے۔

امومت ہی کی بدولت ہمارا وجود پختہ ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی میں ہماری قسمت کی ریکھا ہے۔

اگر علم ہو تو سمجھا جا سکتا ہے کہ لفظ امت (ام = ماں) میں کیا نکتے پوشیدہ ہیں۔

حضرت نبیؐ کا کہنا ہے کہ ماؤں کے پاؤں تلے جنت ہے۔

ملت کے اندر ماؤں کی عزت کرنی مقصود ہے ورنہ زندگی بے مقصد ہو جائے۔

امومت کی وجہ سے رفتار حیات میں تیزی ہے اور اس سے اسرار حیات کے انکشافات ہیں۔

ہماری زندگی جو نہر کی مانند ہے امومت ہی کی وجہ سے اس میں موجیں اٹھتیں گرداب اور حباب بنتے ہیں۔

کوئی گنوار، جاہل، لمبی، موٹی اور بد ہیئت لڑکی ہے اس کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی اور بد سلیقہ بھی ہے نہ غور کرنے کی صلاحیت ہے

اور نہ بات کرنے کا طریقہ جانتی ہے ایسی لڑکی بھی اگر امومت کے فرض کی انجام دہی میں کلفت ایام کو برداشت کرتی ہے اور جان جوکھوں میں ڈال کر اپنی آغوش سے ملت کو ایک غیرت مند اور حق پرست مسلمان بخش دیتی ہے تو اس کی پریشانیوں کی بدولت ہمارے وجود کو قوت مل جائے گی۔ اس کی شام سے گویا ملت کی صبح نمودار ہوگی۔

اس کے برخلاف کوئی نازک اندام، اچھی طرح پروان پائی ہوئی انداز و کرشمہ سے بھرپور وار کرنے والی لڑکی اگر تہی آغوش ہے تو چاہے مغربی علم سے اس کا دماغ کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو بظاہر وہ عورت ہے لیکن درحقیقت نا عورت ہے۔ اس کی شوخ نگاہی اور آزادی سے فتنے پیدا ہوتے اور بے حیائی پروان چڑھتی ہے۔ ایسا پھول اگر ہمارے گلستاں میں نہ کھلے تو بہتر ہے۔ ایسی فتنہ پرور لڑکی کے داغ سے ملت کا دامن پاک رہے تو بہتر ہے۔

کروڑوں مسلمان دنیائے تاریک کے اندر اس مرد کامل کے منتظر ہیں جو ابھی جلوہ آرا نہیں ہوا ہے۔ ایسے افراد کامل ماؤں کے خیابان سے ہی عالم ممکنات میں ظہور پذیر ہوں گے۔

ملت کی دولت روپیہ پیسہ نہیں بلکہ وہ تندرست اولاد ہے جو چاق و چوبند تر دماغ اور محنت کش ہو۔

مائیں ہی اخوت کے راز کی حفاظت کرتی ہیں وہی قرآن و ملت کی قوت ہیں۔

چوتھے حصہ میں ادبیات و فنون لطیفہ پر رائے زنی کی گئی ہے۔ اقبال فن برائے زندگی کے قائل ہیں اور اسی کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

پانچویں حصہ میں سیاسیات مشرق و مغرب سے بحث کی گئی ہے۔ اقبال کے فلسفۂ تمدن سے بحث کی جا چکی ہے پھر بھی اتنی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال شہنشاہیت، اشتراکیت اور موجودہ جمہوریت میں سے ہر ایک طرزِ حکومت سے بیزار ہیں۔ وہ لادین سیاست (SECULARISM) کی بھی سختی سے تنقید کرتے ہیں۔ اشتراکیت سے اتنی امید ضرور وابستہ رکھتے ہیں کہ یہ سرمایہ داری کے نظام کو ختم کر سکے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام حیات انسانی کے لیے زہر ہلاہل ہے یہ جوع الارض (EXPANSIONISM) کے جذبہ کو ہوا دیتا ہے۔

اقبال غلامی کی زندگی پر قناعت کرنے کو کفر سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کی غلامی کا شکوہ ہندوستانیوں سے ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ قابل الزام ہندوستانی ہیں جنہوں نے فرنگیوں کی غلامی کے طوق کو خوشی سے پہن لیا۔

ضربِ کلیم میں آخری حصہ محراب گل افغان کے کلام پر مشتمل ہے اسی طرح ارمغان حجاز میں ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کے کلام کا ایک حصہ درج ہے۔ اقبال نے ان دونوں شعراء کے کلام سے اسی وجہ سے استفادہ کیا ہے کہ یہ حریت اور جوانمردی کی تلقین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا فکر شاعر مشرق کے افکار سے بہت قریب ہے۔

وجہ تسمیہ

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ تیری سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

لہ قرآن حکیم میں مذکور ہے :- واذا ستسقی موسیٰ لقومہ
فقلنا اضرب بعصاک الحجر
فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا قد علم
کل اناس مشربھم کلوا واشربوا من
رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین

ترجمہ :- اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کی سیرابی کے لئے دعا کیا تو ہم نے کہا کہ اپنے عصا سے پتھر پر مار اور تب اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے ہر جماعت کے لوگوں نے اپنے گھاٹوں کو جان لیا - کھاؤ پیو اللہ کی روزی سے اور زمین پر فساد پھیلاتے نہ پھرو -

ناظرین سے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ[1]

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ[2]

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

(شاعر ناظرین پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ زندگی نے اپنی بقا کیلئے معرکۂ جنگ و جدل برپا کر رکھا ہے تنازع للبقاء کی کشمکش میں صرف وہی قومیں زندہ اور پائندہ رہ سکتی ہیں جو سنگین حوادثات سے ٹکرانے کی صلاحیت رکھتی ہیں جب یہ حقیقت ہے تو وہ فن فن ہی نہیں جو نرم و دل گداز موسیقی کا فن ہے۔ نہ ہی فن پروان چڑھ سکتا ہے جو سرمایۂ حیات سے مالا مال ہو اور ایسے فن کی نمود دل و جگر کے خون سے ہی ممکن ہے)

اسلام اور مسلمان

(۱) صبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

---

[1] شیشہ۔ [2] نغمہ ساز

(۲) لا الٰہ الا اللہ

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

---

(۳) تن بہ تقدیر

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب بہ تدریج ؁ وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

؁ آہستہ آہستہ

(۴) معراج

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز | کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج[1]
مشکل نہیں یارانِ چمن معرکۂ باز | پر سوز اگر ہو نفسِ سینۂ دراج[2]
ناوک ہے مسلماں ہدف[3] اس کا ہے ثریا | ہے سرِّ سراپردۂ[4] جاں نکتۂ معراج

تو معنیٔ والنجم[5] نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

(۵) ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا | زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی | ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی | کس طرح خودی ہو لازمانی
آدم کو ثبات کی طلب ہے | دستورِ حیات کی طلب ہے
دنیا کی عشا[6] ہو جس سے اشراق[7] | مومن کی اذاں ندائے آفاق
میں اصل کا خاص سومناتی | آبا مرے لاتی و مناتی

---

[1] منتوح۔ [2] گوریا۔چڑیا۔ [3] نشانہ۔ [4] وہ خاص جگہ جہاں سے ساز سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ [5] قسم ہے ستارہ کی اشارہ ہے آیت قرآنی کی طرف۔ [6] رات۔ [7] صبح۔

تو سید ہاشمی کی اولاد | میری کف خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں | پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے | رگ رگ سے اس کی باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز | سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری[1] | ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت[2] | ہیں ذوق عمل کے واسطے موت
دیں مسلک[3] زندگی کی تقویم[4] | دیں سر محمدؐ و براہیمؑ
دل در سخن محمدی بند[5] | اے پور علیؓ ز بوعلی چند
چوں[6] دیدۂ راہ بیں نداری | قائد قرشی بہ از بخاری

(۶) مسلمان کا زوال

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات | جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور | قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے | زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

---

۱ بے یقینی۔ ۲ آواز۔ ۳ مذہب۔ ۴ جنتری۔ ۵ حضرت محمد صلعم کی باتوں میں دل لگاؤ، تم حضرت علیؓ کی اولاد ہو بوعلی (اربابِ فلسفہ) کی باتیں کب ترک کرو گے۔ ۶ اگر تمہاری نگاہ راہ بیں نہیں ہے تو کسی قرشی کی تقلید کرو نہ کہ کسی بخاری (اربابِ علم و فضل) کی۔

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

(۷) علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتحِ باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

(۸) اجتہاد

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(۹) شکر و شکایت

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغان سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

(۱۰) ذکر و فکر

یہ سب ہیں ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء

مقام ذکر کمالات رومیؒ و عطارؒ
مقام فکر کمالات بو علی سینا
مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکاں
مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ!

(۱۱) تقدیر

نا اہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت
ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی
شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی
ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
براں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی

(۱۲) توحید

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

(۱۳) علم اور دین

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک — دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

آزادیِ شمشیر کے اعلان پر

سوچا بھی ہے اے مرد مسلماں کبھی تو نے — کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعۂ اول ہے کہ جس میں — پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعۂ ثانی کی زیادہ — اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضہ میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

(۱۴) جہاد

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دنیا میں اب نہیں رہی تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر
تیغ و تفنگ دست مسلماں میں ہے کہاں — ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اس کو مسلماں کی موت مر

تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کیواسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر؟

(۱۵) قوت اور دین

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک رو و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

(۱۶) فقر و ملوکیت

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینہ میں ہے قلبِ سلیم

اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام
کہ گرہ غنچہ کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم

(۱۷) اسلام

روح اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کیلئے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصلِ نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

(۱۸) حیاتِ ابدی

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرہ کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(۱۹) سلطانی

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

مثال ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود   خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
ہوا حریف مہ و آفتاب تو جس سے
رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ درخشانی

(۲۰) صوفی سے

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا   مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن   غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی ہے اسے ممکنات کی دنیا

افرنگ زدہ

ترا وجود سراپا تجلّی افرنگ   کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر[1]
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی   فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر
وجود دنیا فقط جوہر خودی کی نمود   کہ اپنی فکر کا جوہر ہے بے نمود ترا
تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود   مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

تصوّف

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی   حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرود   تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہندی اسلام

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خدا داد

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی و محرومی و نومیدی جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

دنیا

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند، یہ تارہ ہے وہ پتھر یہ نگیں ہے

دیتی ہے مری چشم بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ یہ دریا ہے وہ گردوں یہ زمیں ہے

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے

عالم موجودات کے بارے میں حسب ذیل نظریئے :-

(۱) - سارا عالم وجود ذات خداوندی کی ہی بوقلموں صفات کا پھیلاؤ ہے - اس نے اپنی ذات سے ہی عالم کائنات کو بنایا ہے -

(۲) - سارا عالم وجود طلسم نظر و فریب خیال ہے -

(۳) - عالم موجودات ایک حقیقت ہے مظاہر عالم کو طلسم نظر اور فریب خیال نہیں کہا جا سکتا - ان کا خارجی وجود ہے - جو وجود کے پیمانہ کے لئے میزان ہے -

(۴) - عالم وجود تخلیق خداوندی ہے - یہ صفات خداوندی کا پھیلاؤ نہیں بلکہ تابع فرمان خداوندی ہے -

اقبال تیسرے اور چوتھے خیالات کے حامی ہیں - یہاں پر وہ بوقلموں مظاہر کی نفی کرتے ہیں تو اسی لئے کہ ان میں سے ہر شے فنا پذیر ہے - مومن کو فنا نہیں ہے - مومن کا ایمان ہے کہ بڑی اور چھوٹی ہر مخلوق فانی ہے - اس کی حیثیت دائمی نہیں ہے -

نماز

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہے لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

وحی

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا جذب عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیوں کر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

اس نظم سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک یہ کہ عقل جب جاننے کے عمل میں سرگرم ہوتی ہے تو ظن وتخمین کا سہارا لیتی ہے۔ ظن وتخمین سے حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وحی کے امکانات کا تعلق ہمارے وجود کے اجزائے ترکیبی سے ہے (گرحیات آب تم ہو شارح اسرار حیات)

شکست

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

عقل و دل

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقل خداداد کی زد سے
عالم ہے غلام اس کے جلال ازلی کا
اک دل ہے کہ ہر لحظ الجھتا ہے خرد سے

مستی کردار

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

قبر

مرقد کا شبستاں بھی اسے راس نہ آیا
آرام قلندر کو تہِ خاک نہیں ہے

خاموشیِ افلاک تو ہے قبر میں لیکن
بے قیدیِ و پہنائیِ افلاک نہیں ہے

قلندر کی پہچان

کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی اُدھر جا

ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا
ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

فلسفہ

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے

معلوم ہے مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے!

پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے

جس معنیِ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

مردانِ خدا

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری — نہ وہ کہ ضرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش — قلندری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے — انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری
وجود انہیں کا طوافِ بتاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زناری

کافر و مومن

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے — تو ڈھونڈ رہا ہے سمِ افرنگ کا تریاق
اک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند — برندہ و صیقل زدہ و روشن و براق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

مومن (دنیا میں)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
افلاک سے ہے اسکی حریفانہ کشاکش — خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

بچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبریل و اسرافیل کا صیّاد ہے مومن

(جنّت میں)

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس:- اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانی نزدیک و دور دیر و زود
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں:- کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد

ابلیس:- بعد اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود

یزداں:- (فرشتوں کی طرف دیکھ کر)
پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا تھا تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اے روحِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

شیرازہ ہوا امت مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب کہاں بحر عرب میں — پوشیدہ ہے جو مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد — اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

مدنیت اسلام

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب — یگانہ اور مثال زمانہ گوناگوں
نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہد کہن کا فسانہ و افسوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال — عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

فقر و راہبی

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی — تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار — فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو — کہ ہے نہایت مومن خودی کی عریانی

وجودِ صیرفیٔ کائنات ہے اس کا[1] اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی
اسی سے پوچھ کہ پیشِ نگاہ ہے جو کچھ جہاں ہے یا کہ فقط رنگ و بو کی طغیانی

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

تسلیم و رضا

ہر شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہے پیدا پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا ہر لحظہ ہے دانہ کو جنونِ نشو و نما کا
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا

جرأت ہے نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

اسلام دراصل تسلیم و رضا کا ہی دوسرا نام ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں پر تسلیم و رضا کی حقیقت واضح تھی بلکہ یہی تسلیم و رضا عالمِ مکافات میں جہد و عمل پر آمادہ کرنے کا ذریعہ تھی۔ چنانچہ قرآن کی یہ آیت کہ:۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ
(اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لیا ہے اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت مقدر کی گئی) کا مفہوم یہی سمجھا گیا کہ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی خوشنودی کے لئے زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (اللہ کی خوشنودی کے لئے اپنی جانیں قربان کرنی) ایسے اہم ترین

[1] ملاحظہ ہو "دنیا" کا حاشیہ۔

فرائض ہیں جن سے ایک مسلمان بلوغ کے دن سے مرنے تک کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اسے ہر گھڑی اس بات کا اپنے نفس سے محاسبہ کرتے رہنا ہے کہ ذات و مال کا ایثار کس حد تک کر رہا ہے۔

جب خلفائے عباسیہ کے وقت میں متکلمین (جنہیں معتزلہ بھی کہتے ہیں) کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے تسلیم و رضا کا مفہوم جبریت قرار دیا۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں متکلمین میں سے ایک گروہ قدریہ کا بھی پیدا ہوا لیکن تاریخ میں انہوں نے کوئی ایسی جگہ نہ پائی کہ لائق اعتنا ہوں۔ اہل جبر نے کہنا شروع کیا کہ انسان کے کئے کچھ نہیں ہوتا ہے وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ انسان کو نہ عمل کی طاقت ہے اور نہ جہد و ارادہ کی۔ یہ سب کچھ ایک عظیم قوت کے زیر فرمان ہے اور جو کچھ عمل میں آتا ہے وہ ایک بنے بنائے نقشہ کے مطابق ہوتا ہے اس میں نہ کچھ تبدیلی ہوتی اور نہ فرق آتا ہے۔ بس روز ازل ہی وہ سب کچھ طے ہو چکا تھا جو آج ہمارے سامنے ہم سے رونما پذیر ہو رہا ہے یا جو کچھ آنیوالی نسلوں سے سرزد ہونے والا ہے۔ ہماری مثال شطرنج کے مہرہ کی ہے جسے شاطر تقدیر اپنے بنے بنائے منصوبہ کے مطابق الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ چونکہ اس طرح کے خیال سے معاد کا مسئلہ اٹک کر رہ جاتا ہے۔ آخر شطرنج کا مہرہ جا ہے بساط پر ٹھہرے یا زمین پر لڑھک جائے اس میں اس کے عمل کو کیا دخل۔ اگر موجب الزام ہے تو شاطر تقدیر ہی۔ کیونکہ حرکت کا عمل، حرکت کا ارادہ اور حرکت پر قدرت کچھ بھی بیچارے مہرہ کے اختیار میں نہیں۔ جبریوں کا کہنا ہے کہ یہی مقام تسلیم و رضا ہے۔ ۵

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

اشاعرہ نے متکلمین کی ہی اصطلاح و زبان کو اختیار کرکے ان کے طلسم کو توڑنا چاہا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ انسان کو کسب کا اختیار حاصل ہے۔ مگر فلسفے کے پیچ میں وہ ایسے الجھے کہ ان کا کسب جبر سے بھی زیادہ مجبور ہوگیا۔ اگرچہ علمائے خیر نے ہمیشہ لایعنی فلسفہ کی تردید کی اور قرآن و حدیث کے تقاضوں کو پیش کیا۔ مگر اقبالؔ سب سے پہلے شاعر، ادیب اور فلسفی ہیں جنہوں نے شعر و فلسفہ دونوں میں تسلیم و رضا کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جہد، عمل اور ارادہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

نکتۂ توحید

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے

سرورِ جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

جان و تن

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی
روح کس جوہر سے خاکِ تیرہ کس جوہر سے ہے

تیری مشکل مستی و سوز و سرور و درد و داغ
تیری مشکل مے سے ہے ساغر کے مانع سے ہے

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

آدم

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

زمانہ صبح ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

مکہ اور جنیوا

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

اے پیرِ حرم

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں زور جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

مرد مسلماں

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اشاعت اسلام فرنگستان میں

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام

بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبول دین مسیحی سے برہمن کا مقام

اگر قبول کرے دینِ مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہیگا پھر بھی غلام

آزادی

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریت افکار کی نعمت ہے خدا داد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

لا و اِلّا

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا اِلّا
پیام موت ہے جب لا ہوا اِلّا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

امرائے عرب سے

کرے یہ کافر ہندی بھی جرأت گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو وصال مصطفوی، افتراق بولہبی

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

احکام الٰہی

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

موت

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

قم باذن اللہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ

حزیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ

انیسویں بیسویں صدی میں عالم اسلام کے اندر بہتیرے مصلح پیدا ہوئے جن کا مقصود تعلیمات اسلامی کو دگرگوں کر دینے کا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اصلاح برائے اصلاح کا نعرہ بلند کیا اور کچھ لوگوں نے اپنے مشن کو الہامی مشن بتایا۔ یوں تو بقول علامہ ابن خلدون آٹھویں صدی ہجری سے ہی مہدیوں کی پیدائش ہونی شروع ہو چکی تھی۔ مگر تیرہویں اور چودھویں صدی میں دعویٰ نبوت، الہام اور مہدویت کا نیا دور شروع ہوا۔ اگر پہلی مہدویت اسلامی لبادہ میں اجاگر ہوئی تو دوسرے عہد کی مہدویت نے عیسائیت کا لبادہ اوڑھا۔ اگر پہلوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اس عہد کی حکومتوں سے ٹکرا کر سیاسی برتری حاصل کریں تو آخری دور کی مہدویت کا منشا یہ ہوا کہ عیسائی حکومتوں سے اپنے لئے حقوق و مراعات حاصل کرلیں۔ انہوں نے مغربی جابر حکومتوں سے مصالحت کرنے کی ہی تلقین نہ کی بلکہ ان کی غلامی میں اپنے کو سونپ دینے کی تعلیم عام کی۔ غرض وہ دین جو عمل صالح اور سعی بلیغ کا دین تھا۔ اس کو حاکم وقت کی نظر التفات کا متبع بنا دیا گیا۔

اقبال نے اس سلسلہ میں اپنے تاثرات مختلف پیرایہ میں بیان کیا ہے ان سب کو یہاں یکجا کر دیا جاتا ہے۔

مہدیٔ برحق

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے نے جدتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہے جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

محمد علی باب

تھی خوب حضورِ علما باب کی تقریر
بیچارا غلط پڑھتا تھا اعرابِ سماوات
اس کی غلطی پر علما تھے متبسم
بولا تمہیں معلوم نہیں میرے مقامات
اب میری امامت کے تصدق میں ہیں آزاد
محبوس تھے اعراب میں قرآن کے آیات

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

الہام اور آزادی

ہو بندۂ آزاد اگر صاحب الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کیلئے مہمیز

اس کے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاک چمنستاں شرر آمیز

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز

اس مرد خود آگاہ، خدا دوست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

نبوت

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام

ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام

عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

مہدی

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغ چمن کو

مجذوب فرنگی نے بہ انداز فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو
اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردک ناداں کے کفن کو

۲۔ تعلیم و تربیت

مقصود

سپینوزا (BARUCH SPINOZA) ایک پرتگالی یہودی تھا جو ۱۶۳۲ء میں ایمسٹرڈم (AMSTERDAM) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین ہسپانوی شہنشاہ فرڈیننڈ کے خوف سے جان بچا کر یہاں پناہ گیر ہوئے تھے۔ جب یہ افواہ ہر طرف پھیل گئی کہ سپینوزا کے خیالات ملحدانہ ہیں تو ۱۶۵۶ء میں اسے یہودی مذہب کے دائرے سے نکال دیا گیا اس سے پہلے اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ بظاہر دکھاوے کیلئے ہی سہی اپنے خیالات سے رجوع کرلے۔ اس کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ یہاں تک کوشش کی گئی کہ کسی طور اس کو قتل کر کے اس کے خیالات سے دنیا کو نجات دلا دیا جائے سپینوزا کے خیالات نہ یہودیوں کو گوارا تھے، اور نہ عیسائیوں کو گوارا ہو سکتے تھے۔ اپنی آخری

زندگی میں وہ تنہائی میں بسر اوقات کرتا تھا اور اپنے گذر اوقات کے لئے عینکوں کے شیشے بنایا کرتا تھا۔ اس کی عالمانہ صلاحیتوں اور اعلیٰ کردار کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے معتقد ہو گئے تھے۔ جب وہ بہت مشہور ہو گیا تو ہیڈلبرگ میں فلسفہ کی پروفیسری کی پیش کش کی گئی لیکن اس نے قبول نہیں کیا۔ اس کے کردار کا اہم رخ یہ ہے کہ اس نے کبھی مال و دولت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ وراثت کے معاملے میں اس کی بہنوں نے اس کو محجوب کر دینا چاہا تو اس نے قانونی طور پر اپنی حقیقت کو منوالیا اور پھر ساری وراثت اس نے بہنوں کو بخش دیا۔ شاہ فرانسہ کی خواہش تھی کہ وہ اگر اپنی تصنیفات کو اس کے نام سے معنون کر دے تو اسے کچھ گراں قدر عطیہ بخش دیا جائے۔ مگر اس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ایک شخص اس کا اتنا معتقد ہوا کہ وہ اپنی ساری جائداد اس کے نام منتقل کرنے کا خواہش مند ہوا۔ مگر اس نے اس کو اس سے باز رکھا۔ اسی آدمی کے وارثوں نے مرنے والے کی وصیت کے مطابق اس کو پانچ سو فلورین ماہوار وظیفہ دینا چاہا تو اس نے تین سو سے زیادہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سپینوزا :۔ نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

افلاطون :۔ نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

اقبال :- حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

زمانۂ حاضر کا انسان

عشق[1] ناپید و خرد می گزدش صورت مار
عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اقوام مشرق

نظر آتے نہیں بے پردہ حقایق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو خود ہے لب گور

آگاہی

نظر سپہر پہ رکھتا ہے جو ستارہ شناس
نہیں ہے اپنی خودی کے مقام سے آگاہ
خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکت صبح و شام سے آگاہ

---

۱ عشق ظاہر نہیں ہے اور عقل اس کو سانپ کی طرح ڈس رہی ہے۔

وہی نگاہ کے ناخوب و خوب سے محرم
وہی ہے دل کے حلال و حرام سے آگاہ

مصلحینِ مشرق

میں ہوں نومید تیرے ساقیانِ سامری فن سے
کہ بزمِ خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

مغربی تہذیب

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہی نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

اسرارِ پیدا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

سلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

بیداری

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

اس کی نگہ شوق پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اس مرد خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحب آفاق

تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرم اعماق

خودی کی تربیت

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

یہی ہے سر کلیمی ہر اک زمانہ میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانی ہمہ روز

آزادیٔ فکر

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

خودی کی زندگی

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

حکومت

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن — شیخ و ملا کو بری لگتی ہے درویش کی بات
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاع کردار — بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات
گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم — کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا — انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

ہندی مکتب

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا — ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علم نباتات

تربیت

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادہ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

خوب و زشت

ستارگانِ فضاہائے نیلگوں کی طرح — تخیلات بھی ہیں تابعِ طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب — یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جسکی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

مرگ خودی

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روح عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام[1]
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

مہمان عزیز

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں کس کو ہے تمیز
چاہیے خانۂ دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

عصر حاضر

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

[1] ہڈی

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ کو عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

طالب علم

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

امتحان

کہا پہاڑ کی ندی نے سنگ ریزے سے
فتادگی و سرافگندگی تری معراج
ترا یہ حال کہ پامال و درد مند ہے تو
مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج
جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا
کسے خبر کہ تو ہے سنگ خارا یا کہ زجاج

مدرسہ

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش
مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

حکیم نطشہ

نطشہ (FRIEDRICH NIETZSCHE) کے بارے میں حصۂ اول میں لکھا جا چکا ہے۔

حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرارِ لا الہ کے لیے
خدنگ سینۂ گردوں ہے اسکا فکرِ بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کیلئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اسکی
ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے

اساتذہ

مقصد ہو اگر تربیتِ لعلِ بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو
دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کا تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پیرو

دین و تعلیم

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعوئ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف　　اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

جاوید سے

(۱)

غارت گرِ دیں ہے زمانہ　　ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربارِ شہنشہی سے خوشتر　　مردانِ خدا کا آستانہ
لیکن یہ دورِ ساحری ہے　　انداز ہیں سب کے جادوانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک　　باقی ہے کہاں مئے شبانہ
خالی ان سے ہوا دبستاں　　تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جس گھر کا مگر چراغ تو ہے　　ہے اس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخِ گل پر چہک ولیکن　　کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا　　ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ
دہقاں اگر نہ ہو تن آساں　　ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ

غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
وقتِ ہنرست و کارسازی ست

(۲)

سینہ میں نہ ہو اگر دلِ گرم — رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست — آتی نہیں کام کہنہ دامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں — شرط اس کیلئے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقتِ حقیقی — غیرت سے ہے فقر کی تمامی
اے جانِ پدر نہیں ہے ممکن — شاہیں سے تذرو کی غلامی
نایاب نہیں متاعِ گفتار — صد انوری و ہزار جامی
ہے میری بساط کیا جہاں میں — بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدق مقال ہے کہ جس سے — میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے جسے دے — میراث نہیں بلند نامی
اپنے نورِ نظر سے کیا خوب — فرماتے ہیں حضرت نظامی

جائے کہ بزرگ بایدت بود
فرزندیِ من نداردت سود

(۳)

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز — دین و دولت قمار بازی
ناپید ہے بندۂ عمل مست — باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی

روشن اس سے خرد کی آنکھیں | بے سرمۂ بوعلی و رازی
حاصل اس کا شکوہِ محمود | فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل | رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب | دریردہ تمام کارسازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا | بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

۳ - عورت

مردِ فرنگ

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا | مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں | گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

ایک سوال

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے | ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

پردہ

بہت رنگ بدلے سپہر بریں نے
خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردہ میں اولادِ آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

خلوت

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر ولیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

عورت

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

آزادیٔ نسواں

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا / گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب / پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش / مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ / آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

عورت کی حفاظت

اک زندہ حقیقت مرے سینہ میں ہے مستور / کیا سمجھے گا وہ جسکی رگوں میں ہے لہو سرد

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی / نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا / اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

عورت اور تعلیم

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت / ہے حضرت انساں کیلئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن / کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن / ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

عورت

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر / مرد کی ذات سے ہے جوہر عورت کی نمود

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق | آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات | گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں مشکل مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

ادبیات و فنونِ لطیفہ

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر | گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی | بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات | نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی | خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

تخلیق

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود | کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے | اس آب جو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانہ کی گردش پہ غالب آتا ہے | جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں | ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں کہ ہوں میرے بھی ہم عناں پیدا

اپنے شعر سے

ہے گلہ مجھ کو تری لذت پیدائی سے
تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثل شرر آوارہ نہ ہو
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

پیرس کی مسجد

مری نگاہ کمال ہنر کو کیا دیکھے
کہ حق سے یہ حرم مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے فرنگی کے کرشمہ سازوں نے
تن حرم میں چھپا دی ہے روح بتخانہ
یہ بت کدہ انہیں غارتگروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

ادبیات

عشق اب پیروی عقل خدا داد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہیں روح کو تقلید سے آزاد کرے

نگاہ

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں
طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

مسجدِ قوت الاسلام

ہے مرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی
لا الٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوقِ نمود
چشمِ فطرت بھی نہ پہچان سکے گی مجھ کو
کہ ایازی سے دگرگوں ہے مقامِ محمود
کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے
کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود
ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود
اب کہاں میرے نفس میں وہ حرارت وہ گداز
بے تب و تابِ دروں میری صلوٰۃ اور درود
ہے مری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود

تیاتر

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

شعاعِ امید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں — بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت — نے مثل صبا طوف گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ — چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں — بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن — افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذت نظارہ سے محروم — لیکن صفت عالم لاہوت ہے خاموش

(۳)

ایک شوخ کرن شوخ مثال نگہ حور — آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن — یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ در ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی — جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اہل ہنر سے

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ
عشق سے ہے پائدار تیری خودی کا وجود

تیرے حرم کا ضمیر اسود و احمر سے پاک
ننگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود

تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر
تیری خودی کا حضور عالم شعر و سرود

روح اگر ہے تری رنج غلامی سے زار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن تو ہے امیر جنود

وجود

اے کہ ہے زیر فلک مثل شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقامات وجود

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

مکتب و میکدہ جز درس نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

سرود

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

دل کیا ہے اس کی مستی و قوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے

کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے

جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

اہرامِ مصر

اس دشتِ جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر

مخلوقاتِ ہنر

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیر
فاش ہے چشمِ تماشا پہ نہاں خانۂ ذات
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آہ وہ کافرِ بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہ ٹوٹے ہوئے لات اور منات

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ ہنر ذوقِ ہنر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

جدّت

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

جلال و جمال

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

مصوّر

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی، نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے، دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

سرودِ حلال

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقام محمود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا زمزمۂ لاموجود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہان خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

سرودِ حرام

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرود
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے
فقیہ شہر کہ ہے محرم حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

فوّارہ

یہ آبِ جُو کی روانی یہ ہمکناری خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اُدھر نہ دیکھ اُدھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

شاعر

مشرق کی نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی نے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے
ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

شعر عجم

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولت پرویز
اقبالؔ یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہر چہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

ہنروران ہند

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کا مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نگار
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

عالم نو

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر
اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اسے
کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر
بدن اس تازہ جہاں کا ہے اسی کی کف خاک
روح اس تازہ جہاں کی ہے اسی کی تکبیر

ایجاد معانی

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مرد مسلمان ہے آزاد
خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

موسیقی

وہ نغمہ سردیٔ خون غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبان لالہ چاک نہیں

ذوق نظر

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاد سے دم تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دل کشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکی شمشیر

رقص موسیقی

شعر سے روشن ہے جان جبرئیل و اہرمن
رقص موسیقی سے ہے سوز و سرور انجمن
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرار فن
شعر گویا روح موسیقی ہے رقص اسکا بدن

رقص

چھوڑ یورپ کے لیے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

سیاسیات مشرق و مغرب

اشتراکیت

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ رفتار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

جو حرف قل العفو[۱] میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کارل مارکس کی آواز

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارہ پرانے افکار کی نمائش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش، مریز و کجدار کی نمائش
جہان مغرب کے بتکدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہیں عقل عیار کی نمائش

انقلاب

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و ساز حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آگئی شاید جہان پیر کی موت

---

۱ یہ قرآن کی آیت سے ماخوذ ہے ویسئلونک ماذا ینفقون. قل العفو. اور آپ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ کتنی مقدار میں کار خیر میں خرچ کیا جائے. کہہ دیجئے کہ جو کچھ بچتا ہے. اسلامی تعلیم میں مالیات سے متعلق دو باتوں کی وضاحت ہے۔ (۱) یہ کہ کسی مسلمان کو فضول خرچی کا حق نہیں۔ (۲) یہ کہ وہ پس ماندہ نہیں رکھ سکتا. مال کا جمع کرنا اپنے لئے حطمہ یعنی نار جہنم کی مصیبتوں کو جمع کرنا ہے اسی طرح ذخیرہ اندوزی وغیرہ بھی قطعی حرام ہے۔ اشتراکیت اور اسلام دونوں سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں۔

خوشامد

میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ، ولیکن
ارباب نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز

کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد
دستور نیا، اور نئے دور کا آغاز

معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت
کہہ دے کوئی الّو کو اگر 'رات کا شہباز'

مناصب

ہُوا ہے بندۂ مومن فسونیِ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک

ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی
سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعتِ چالاک

شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

یورپ اور یہود

یہ عیشِ فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلّی

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی

نفسیاتِ غلامی

شاعر بھی ہیں پیدا، علما بھی، حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

نفسیاتِ حاکمی

یہ مہر ہے بے مہریِ صیاد کا پردہ
آئی نہ میرے کام مری تازہ صفیری

رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری

سیاستِ افرنگ

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

خواجگی

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی دورِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں تمام

اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

غلاموں کے لئے

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اہل مصر سے

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم
دفعۃً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیمؑ

ابی سینیا

(۱۸ اگست ۱۹۳۵ء ابی سینیا (موجودہ ایتھوپیا) جس پر مسولینی نے
ہر طرح کے مظالم روا رکھے تھے۔)

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش

پیر کلیسا یہ حقیقت ہے دل خراش

ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

لا کر برہمنوں کو سیاست کے بیچ میں
زناریوں کو دیر کہن سے نکال دو

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

جمعیت اقوام مشرق

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہ فلک پیر بدل جائے

دیکھا ہے ملوکیت افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

جمہوریت

اس راز کو اک مرد فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مسولینی

اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم — بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں — ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم — تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں — راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجا ہے نہ راج

آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے — اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

تم نے لوٹے بے نوا صحرانشینوں کے خیام — تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

گلہ

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک — بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ — پوشیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

لادین سیاست

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادیں
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی
تو ہیں ہراول لشکر کلیسیا کے سفیر

انتداب

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری

جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ میخواری

بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق
طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بیزاری

جسور و زیرک و پردم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمۂ جاری

نظر وران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمیں مدنیت سے ہے ابھی عاری

دام تہذیب

اقبال کو شک اسکی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار

یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار

ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

نصیحت

اک لُرڈ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر

بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
بّرہ پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

ایک بحری قزاق اور سکندر

سکندر:- صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

قزاق:- سکندر حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی

ترا پیشہ ہے سفاکی مرا پیشہ ہے سفاکی
کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی

غلاموں کی نماز

ترکی وفد ہلال احمر لاہور میں

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام

وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام
بدن غلام کا سوزِ عمل سے ہے محروم
کہ ہے مرورِ غلاموں کے روز و شب پہ حرام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

فلسطینی عرب سے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

مشرق و مغرب

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے، نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

ضرب کلیم کی غزلیں

(۱)

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

ترا بحر پر سکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابی کنارہ

تو ضمیر آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بیقرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہان دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخیٔ نظارہ

(۲)

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

تو مری نظر میں کافر میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری مرا دیں نفس گدازی

تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافق تدرواں نہیں دین شاہبازی

ترے دشت و در میں مجھکو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی

(۳)

ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ

فروغ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحب مازاغ

وہ بزم عیش ہے مہمان یک نفس دو نفس
چمک رہے ہیں مثال ستارہ جس کے دماغ

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

(۴)

دریا میں موتی اے موجِ بیباک
ساحل کی سوغات خار و خس و خاک

میرے شرر میں بجلی کے جوہر
لیکن نیستاں تیرا ہے نم ناک

تیرا زمانہ تاثیر تیری
ناداں نہیں یہ تاثیرِ افلاک

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منتِ تاک

رکھتا ہے اب تک میخانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو ادراک

اہلِ نظر ہیں یورپ سے نومید
ان امتوں کے باطن نہیں پاک

محراب گل افغان کے افکار

(۱)

میرے کہستاں تجھے چھوڑ کے جاؤں کہاں
تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک

تیرے خم و پیچ میں ہے میری بہشت بریں
خاک تری عنبریں، آب ترا تابناک

باز نہ ہوگا کبھی بندۂ کبک و حمام
حفظ بدن کے لئے روح کو کردوں ہلاک

اے مرے فقر غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

(۲)

کیا چرخ کج رو، کیا مہر، کیا ماہ
سب راہرو ہیں واماندۂ راہ

کڑکا سکندر بجلی کی مانند — تجھ کو خبر ہے اے مرگ ناگاہ
نادر نے لوٹی دلی کی دولت — اک ضرب شمشیر، افسانہ کوتاہ
افغان باقی کہسار باقی — الحکم للہ الملک للہ
حاجت سے مجبور مردان آزاد — کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ
محرم خودی سے جس دم ہوا فقر — تو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ
قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش — جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

(۳)

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان — تو بھی اے فرزند کہستاں! اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی ہے زرخیز — جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا — جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ — اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج — عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

(۴)

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس — پر شہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس

یوں بھی دستورِ گلستاں کو بدل سکتے ہیں
کہ نشیمن ہو عنادل پہ گراں مثلِ قفس

سفر آمادہ نہیں منتظرِ بانگِ رحیل
ہے کہاں قافلۂ موج کو پروائے جرس

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

پرورشِ دل کی اگر مدِ نظر ہے تجھ کو
مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس

(۵)

وہی جواں ہے قبیلہ کی آنکھ کا تارہ
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز
کہ نیستاں کے لیے بس ہے ایک چنگاری

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو
یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلہ داری

(۶)

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میسر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی

در معرکہ بے سوز تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی

خورشید سراپردۂ مشرق سے نکل کر
پہنا مرے کہسار کو ملبوسِ حنائی

(۷)

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

دنیا میں محاسب ہے تہذیبِ فسوں گر کا
ہے اس کی فقیری میں سرمایۂ سلطانی

یہ حسن و لطافت کیوں؟ وہ قوت و شوکت کیوں — بلبل چمنستانی، شہبازِ بیابانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن — بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا — تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

اقبال کی دو بیتیاں عرفِ عام میں رباعیات کے نام سے مشہور ہوئیں ہم بھی ایسی دو بیتوں کو رباعی کہنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے۔ مگر عروض کے اصول کے مطابق یہ رباعی کی بحر نہیں ہے۔ اقبال نے باباطاہر عریاں کے تتبع میں یہ دو بیتیاں لکھیں۔ ظاہری قالب کے اعتبار سے یہ رباعی کی بحر نہیں ہے۔ لیکن معنوی طور پر رباعیات سے بہت ملتی جلتی ہے اس لئے عام لوگوں نے اسے رباعیات ہی کہا۔ چند دو بیتیاں بال جبریل اور ارمغان حجاز کے حوالے سے نقل کی جاتی ہیں۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی — مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور — مری دنیا میں تیری پادشاہی

وہی اصل مکان و لامکاں ہے　　مکاں کیا شے ہے انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے　　اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

خدائی اہتمام خشک و تر ہے　　خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ　　یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا　　کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں　　یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا

رہ و رسم حرم نا محرمانہ　　کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک　　نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

یقیں مثل خلیل آتش نشینی　　یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار　　غلامی سے بتر ہے بے یقینی

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی　　نفس ہندی، مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ　　طبیعت غزنوی قسمت ایازی

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے　　تری پرواز لولاکی نہیں ہے

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی ہوئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغان صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ہو میں

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمی محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

مری شاخ امل کا ہے ثمر کیا
تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا
کلی گل کی ہے محتاج کشود آج
نسیم صبح فردا پر نظر کیا

فراغت دے اسے کار جہاں سے
کہ چھوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہ تازہ تر لائے کہاں سے

غریبی میں ہوں محسود امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سر بزیری

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

حکیمی نامسلمانی خودی کی
کلیمی رمز پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

زمانہ کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

چھٹا باب

اقبال کی چند معرکۃ الآرا نظمیں

ضربِ کلیم کے بعد بالِ جبریل اور ارمغانِ حجاز کا زمانہ آتا ہے۔ اب شاعر کے کلام میں پختگی بلند ترین معیار پر پہنچ چکی ہے۔ نصب العین وہی ہے۔ فکر کی تنظیم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر اسلوب اور انداز بیان میں کافی رفعت پیدا ہو چکی ہے جو نظمیں اس مجموعے میں شریک کی جا رہی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) طارق کی دعا۔ (۲) لینن خدا کے حضور میں۔ (۳) ذوق و شوق۔ (۴) ساقی نامہ۔ (۵) زمانہ۔ (۶) جبریل و ابلیس۔ (۷) مسجد قرطبہ۔ (۸) ابلیس کی مجلس شوریٰ۔

ان نظموں کے علاوہ مختصر نظموں میں

(۱) فرشتوں کا گیت۔ (۲) فرمان خدا (۳) گدائی (۴) دین و سیاست (۵) لالۂ صحرا (۶) فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں۔ (۷) روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے (۸) محبت (۹) جاوید کے نام (۱۰) ابلیس کی عرض داشت (۱۱) باغی مرید (۱۲) بڈھے بلوچ کی نصیحت اد

(۱۳) نصیحت ۔

کو خصوصی طور پر اس لیے شامل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو ضرب کلیم اور بال جبریل و ارمغان حجاز کی نظموں میں تمیز کرنے کا موقع مل سکے ۔

فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقشِ گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی[1]

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ! کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

فرمانِ خدا (فرشتوں سے)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

---

[1] ایک جگہ اقبال نے کہا ہے ؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے گویا ۔ کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون ۔ اقبال اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ہر دو زمکانات کی آغوش سے ابھرتی ہوئی کائنات تشکیل پاتی رہتی ہے۔ ناتمام کائنات تکمیل و اتمام کی طرف بڑھ رہی ہے ہمارے نقطۂ نظر سے کائنات ابھی ”مکمل“ کی شکل میں جلوہ گر نہیں ہوئی ۔

لہ سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیران کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے — آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو

لہ اقبال ہر طرح کے مغربی طرز سلطانی سے اختلاف رکھتے ہیں۔ سلطانی جمہور کا تصور کمیونزم کی اصطلاح میں ایسے نظام کا نام ہے جس میں کوئی ریاست نہیں ہوگی۔ ہر فرد اپنے تئیں ذمہ دار ہوگا اور محض امداد باہمی کے ذریعہ سارا کام انجام پائیگا۔ سلطانی (SOVEREIGNTY) بغیر کسی جابر قوت کے ممکن ہے؟ تاریخ عالم اس سوال کا جواب از روئے نفی ہی دیتی ہے چنانچہ وہ حکومتیں جو اس نام پر قائم ہوتیں کہ بر دست وہ اشتمالی اور اجتماعی (SOCIATSTIC) طرز حیات کی طرفداری کریں گی اور رفتہ رفتہ جب لوگوں کے ذہن اشتراکی نصب العین کے مطابق ہو جائیں گے تو اشتراکیت (COMMUNIST REQINE) کی بنیاد پڑ جائے گی مگر حق یہ ہے کہ۔ اشتمالی اور اجتماعی حکومت اشتراکیت کی طرف اقدام کرتی ہوئی تاناشاہی راج میں تبدیل کر گئی۔ آج جہاں کہیں بھی اشتمالیت کے نام سے حکومت قائم ہے وہ بنیادی طور پر (TOTALITARIAN - STATE) ہی ہیں۔ اور تمام تر صورت حال وہی ہے جس کا خاکہ جارج اورول (GEORGE ORWELL) نے اپنی شہرآفاق کتاب قفس یا (ANIMAL-PRISON) میں اڑایا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے سامنے اشتمالی حکومتوں کی پوری تصویر نہیں آئی اور اس لئے وہ اشتمالیت پسندوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو گئے۔

گدائی

(یہ انوری آیبوری کی نظم گدا کیست کا آزاد ترجمہ ہے)

میکدہ میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اسکی کیمیا
اس کے نعمت خانہ کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مرد غریب بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

دین و سیاست

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کیلئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

شاہیں

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل — نہ بیماریِ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ!
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

لالۂ صحرا

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی — مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو — منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ — تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا — اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی
غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو — ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ — دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم — سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

باغی مرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

شہری ہو، دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ
مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

نذرانہ نہیں، سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

زمانہ

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ!

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

ہر ایک سے آشنا ہوں، لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب، کسی کا مرکب، کسی کو عبرت کا تازیانہ

نہ تھا اگر تو شریکِ محفل، قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا، نظر نہیں جس کی عارفانہ

شفق نہیں مغربی افق پر، یہ جوئے خوں ہے، یہ جوئے خوں ہے!
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ
ہوائیں ان کی، فضائیں ان کی، سمندر ان کے، جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی!
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری ضیا دیکھ!

اذاں

اک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟

کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار

بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی!
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار

واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار

آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

قطعہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

محبت

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی!

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے — تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں — محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

ستارہ کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی — مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا — کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

ابلیس کی عرضداشت

کہتا تھا عزازیل خداوندِ جہاں سے! — پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک!
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب! — دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک!
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت — مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک!
تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی — ویرانیٔ جنت کے تصور سے ہیں غمناک!
جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک!

لہو

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس — اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا اس کو — نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غمِ افلاس

پرواز

کہا درخت نے اک روز مرغِ صحرا سے
ستم پہ غم کدۂ رنگ و بو کی ہے بنیاد!

خدا مجھے بھی اگر بال و پر عطا کرتا
شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالمِ ایجاد!

دیا جواب اسے خوب مرغِ صحرا نے
غضب ہے، داد کو سمجھا ہوا ہے تو بیداد!

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد!

ملّا اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

الارض للّٰہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
دہ خدایا[۱]، یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
ترے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

نصیحت

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کا کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اسکو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

---

[۱] زمیندار۔ کھیت کا مالک۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

(۱) جاوید کے نام

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ
حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش ۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ ۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا ۔ مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاص عمل مانگ نیاکان کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

(۲) جاوید کے نام

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر ۔ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو ۔ سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں ۔ سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر ۔ مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

فلسفہ و مذہب

یہ آفتاب کیا یہ سپہر بریں ہے کیا : ۔ سمجھا نہیں تسلسل شام و سحر کو میں !
اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں ؟ ۔ ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں
کھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز ۔ لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں — رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

"جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

مسجد قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیٔ کائنات!
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات!
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات!

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا!
نقش کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا!

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سُبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود!
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلّے سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود!
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا
اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق!
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود!

شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جمیل و جلیل!
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل!
تیرے در و بام پر وادئ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل!
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل!
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل!
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!
ساقئ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل!

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ ارباب فن! سطوت دین مبیں!
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں!

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں!
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں!
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں!
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

حرف غلط بن گئی عصمت پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں!
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملت رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذت تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں!
روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیِ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!
سادہ و پُرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب!
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب!

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب!
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

مسجد قرطبہ اقبال کا اردو میں شاہکار فن ہے۔ اس کے اندر صوری اور معنوی ساری ان صنعتوں کا استعمال ہوا ہے۔ جو مشرق و مغرب کی بلاغتوں نے پیدا کیا ہے۔ ایما، جذباتیت، حقیقت پسندی، شعریت۔ کونسی ایسی خوبی ہے جو اس نظم میں جمع نہیں ہوئی۔ شاعر نے اس نظم کو اندلس کے اندر مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھا تھا۔

مسجد قرطبہ فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ اس مسجد کا طول ساڑھے چھ سو فیٹ اور عرض تقریباً ساڑھے چار سو فیٹ ہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت کی یادگار کوئی عمارت ایسی نہیں جس سے اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اس نظم کے اندر آٹھ بند ہیں۔ ہر ایک بند کا تجزیہ کر لینے کے بعد

ہم دوسری خوبیوں کی طرف نظر کریں گے۔

(۱) شاعر نے باسلسلہ زمان (SERIAL TIME) کی ترجمانی کی ہے اور بتایا ہے کہ باسلسلہ زمانہ جو گردش شام و سحر سے عبارت ہے ہر وقت اور ہر لمحہ انقلاب پذیر ہے۔ یہ انقلاب کون سے فساد کی طرف یا ہستی سے نیستی کی طرف ہوتا ہے۔

(۲) باسلسلہ زمان پر حادی ہونے کی صلاحیت عشق کے اندر ہے۔ عشق مردِ خدا کا معیار ہے اور اسی عشق کی بدولت مرد خدا کا ہر عمل گردش زمان کے انقلابات سے محفوظ رہتا ہے۔ کیونکہ عشق کا تعلق زمان متسلسل سے نہیں بلکہ زمان حقیقی سے ہوتا ہے جو مرور خالص یا استدام (PURE-DURATION) ہے۔

(۳) مسجد قرطبہ صاحب عشق مرد خدا کا معجزۂ فن ہے جو خون جگر سے فروغ پاتا ہے۔ شاعر بھی صاحب عشق ہے اور وہ مسجد قرطبہ کی حقیقت کو سمجھتا ہے جس طرح مسجد قرطبہ شاعر کے جذبۂ بے اختیار کو سمجھ سکتی ہے۔

(۴) مرد خدا یا مردِ مسلمان اور مسجد قرطبہ کے درمیان بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ مسجد قرطبہ کا وجود ہی مرد خدا کے عشق اور جذبۂ کامل کا آئینہ دار ہے۔

(۵) مسجد قرطبہ کے آئینہ میں مرد خدا کے صفات و کمالات کو دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

(۶) مسجد قرطبہ کے جلال و جمال کا نقش قلب مسلماں بیں ہے۔ وہی

مردِ مسلماں جن کے اثرات مسجد قرطبہ کے گرد و نواح میں اب تک نمایاں ہیں باوجودیکہ سرزمین قرطبہ میں ایک بھی مردِ مسلمان نہیں ہے جو اس کی فضا میں آوازِ اذان بلند کر سکے

(۷) کائنات کے اندر روز بروز انقلابات آتے رہتے ہیں بمغرب کا طلسم بھی آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا ہے۔ قرطبہ کا مردانِ حق سے خالی ہونا اگرچہ روح فرسا ہے۔ مگر امید افزا حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ ایک بار پھر مردِ مسلماں کے دل میں نشأۃ ثانیہ کے لئے اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ کائنات کی آغوش میں ایک اور انقلاب پل رہا ہے۔

(۸) ہر غروب کے ساتھ آنے والے سحر کی نشانی آسمان کے ماتھے پر موجود رہتی ہے اور ہر جوانی خواہ کتنی ہی سادہ کیوں نہ ہو اپنے تئیں تلاطمہائے عشق و مستی کا طوفان ہوتی ہے۔ عالمِ پیر کے غروب کا وقت ہے کہ عالمِ نو کے ابھرنے کے اثرات نمایاں ہیں طوفان عشق و جذبۂ صادق امنڈنے والا ہے۔ عالمِ نو کی تعمیر کے لئے بھی خونِ جگر کی ضرورت ہے تاکہ اس کا نقش بھی مسجد قرطبہ کی طرح مکمل و پائیدار ہو۔ یہ وہ رازِ کائنات ہے جس کو اگر عہدِ حاضر کے شعبدہ باز جان لیں تو ان کا طلسم خود بخود ٹوٹ جائے۔

اب ذرا محاسن صوری پر غور کرو:۔

پہلے بند میں بحر کی روانی پر غور کرو۔ ہر مصرعہ دو ٹکڑے میں بٹ جاتا ہے۔ مثلاً پڑھتے وقت سلسلۂ روز و شب پر ایک ٹھہراؤ ہوتا ہے تو نقش گرِ حادثات پر دوسرا ٹھہراؤ۔ شعر کی موسیقی ہی سے روز و شب کا

زنجیری سلسلہ واضح ہو جاتا ہے۔

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے دنوں کے الٹ پھیر کا نام ہے

پھر یہی شعر کی روانی اور ٹکڑے ٹکڑے ٹھہراؤ زمانہ کی اس خوبی کو واضح کر دیتا ہے کہ اس کی غیر محسوس رفتار کتنی مستقل اور متواتر ہے۔ پھر بھی سکوت اور ٹھہراؤ کا گمان گزرتا ہے۔ اسی ایک بند کے اندر سلسلۂ روز و شب کا ٹکڑا بار بار دہرایا گیا ہے۔ اگرچہ اسم ضمیر کے استعمال سے وہ مفہوم ظاہر ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تکرار یکسانیت اور تواتر کے مفہوم کو محض صوتی طور پر واضح کرتا ہے یعنی سلسلۂ شب و روز یکساں اور متواتر دن اور رات کی سفید اور سیاہ زنجیر ہے جو ایک دوسرے میں پیوستہ اور بے نہایت ہے۔ اسی طرح حیات و ممات تارِ حریرِ دو رنگ زیر و بم ممکنات سے بھی متضاد کڑیوں کی باہم پیوستگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

سلسلۂ روز و شب کی وجہ سے حادثات مرتب ہوتے ہیں۔

(حادثات ان نشانات کا نام ہے جنہیں تاریخ سینۂ ایام پر اس لئے ثبت کر دیتی ہے تاکہ ہم اپنی متناہی عقل سے زمان کا ادراک کر سکیں) حادثات کا مرتب ہونا زمان کی تغیر پسندی کی وجہ سے ہے۔ یہی تغیر پسندی جو زمان کا مزاج ہے، حیات و ممات کا اصل ہے، گویا سلسلہ روز و شب کی وجہ سے زمانہ حرکت کرتا ہے یہی حرکت تغیر ہے اور تغیر کی وجہ سے حیات و ممات کا سلسلہ قائم ہے۔

زمانہ صفاتِ الٰہی کے قبا کا تارِ حریرِ دو رنگ ہے۔ قبائے صفات

دورنگی کپڑا ہے - خدا زمان حقیقی ہے لیکن وہ تغیرات سے منزہ ہے اور فوق الادراک بھی - وہ لباس صفات کو زیب تن کرکے ہمارے ادراک پر جلوہ آرا ہوتا ہے - ہم شب وروز کے چکر میں پھنسے ہوئے انسان جب اسکی تجلی کی طرف نظر اٹھاکر دیکھتے ہیں تو رحمانی اور جباری کے اوصاف کو باہمد گر پیوستہ پاتے ہیں یہ روز و شب کی گرفت ہے کہ ہم ذات (جو جامع حقیقت ہے) کا من حیث مجموع تعقل کر ہی نہیں کرسکتے -

یہی سلسلۂ روز و شب کن فیکون کی بھی حقیقت ہے ممکنات کا ظہور و حدوث سلسلۂ روز و شب کے تابع ہے اور ازل سے تشکیل پذیری کائنات جاری ہے - وہ سلسلۂ روز و شب یعنی زمان کے گہوارہ میں ہی رونپذیر ہوتی ہے -

روز و شب کے الٹ پھیر میں سکہ کی طرح ہماری شخصیتیں پرکھی جاتی ہیں اگر ہم کھوٹے ہوتے ہیں تو موت ہمارے حصہ میں آتی ہے (مردان حق نہیں مرتے ورنہ سب مرجاتے ہیں - مردان حق وہی کھرے لوگ ہیں -)

باسلسلہ زمانہ کی بات اب تک ہوئی لیکن قرطبہ کے سیاق میں شاعر زمان حقیقی کی بات کرتا ہے -

زمان حقیقی گردش شام وسحر نہیں ہے اسے ماضی اور مستقبل میں تقسیم بھی نہیں کیا جاسکتا آگے چل کر شاعر نے اس کی وضاحت کی ہے سہ

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور بھی زمانے ہیں جن کا نہیں کوئی نام

چونکہ یہاں پر اس بات کا محل نہیں کہ زمان حقیقی اور زمان ظلی کی تخصیص کی جا سکے۔ مزید براں یہ کوئی آسان کام بھی نہیں خود اقبال کا خیال ہے کہ ذہنی واردات کی بدولت حقیقت زمان کو سمجھا نہیں جا سکتا ؎

نکتۂ غیب و حضور اندر دل است
رمز ایام و مرور اندر دل است
نغمۂ خاموش دارد ساز وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی لاز وقت

ایام وہی سلسلۂ روز و شب ہے اور مرور (DURATION) وہی زمان حقیقی ہے۔

بہر حال ایک موٹی سی مثال سے زمان کے راز کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم جانتے ہو کہ زمان ایک وسعت بے پایاں ہے۔ اب اس وسعت بے پایاں کو ایک بحر بیکراں تسلیم کر لو۔ فرد کو حقیر ترین چیونٹی اور حادثات کو بحر بیکراں کی سطح پر پڑی ہوئی ایک گھاس مان لو۔ اب تصور کی نظر سے دیکھو کہ روانی آب کے ساتھ گھاس تیرتی ہوئی چیونٹی کے سامنے آتی ہے اور آگے کی طرف نکل جاتی ہے۔ آنے والی حالت استقبال ہے۔ گھاس کا روبرو ہونا حال اور گزر جانا ماضی ہے۔ لیکن یہ مستقبل حال اور ماضی کی تخصیص اس چیونٹی کے نقطۂ نظر سے ہوا بحر بیکراں کے نقطۂ نظر سے سطح آب پر اس گھاس کا تیرنا چیونٹی کے وجود سے بہت پہلے تھا اور ہمیشہ سطح آب پر موجود ہے۔ اس کے حقیقی معنوں میں مستقبل یا ماضی ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا وہ ہر حال میں حال ہے۔ یا سلسلہ زمان

ہمارے نقطۂ نظر سے ہے ورنہ زمان کی وسعت بیکراں میں سب کچھ موجود ہے۔ چونکہ حرم قرطبہ کا وجود زمان حقیقی سے وابستہ ہو کر لازمانی ہوگیا ہے اس لئے وہ رات اور دن کے تواتر سے بے نیاز ہے۔ کائنات کی نظر میں زمان حرکت پذیر اور تغیر پذیر ہے۔ مسجد قرطبہ اپنے دائمی وجود کی وجہ سے حرکت و تغیر پذیری سے منزہ ہو چکی ہے۔ یہ ایک عجیب معجزہ ہے کہ عالم کائنات کی ہر شے پر امتداد زمانہ کا اثر ہوتا ہے مگر مسجد قرطبہ گردش شام و سحر کا اثر قبول نہیں کرتی۔

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اُچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات!

وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طورِ سینا و فاراں دونیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن تصوف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے — نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوتِ انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرتِ آئینۂ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

دما دم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل — خوش آئی اسے محنتِ آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے — تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہان مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاق دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رم یک نفس

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے — خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے راز درون حیات — خودی کیا ہے بیداری کائنات:

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں — یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمود سے درگزر — خودی کو نگہ رکھو ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں!
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں!
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت — تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت یہ ہے جامۂ حرف تنگ — حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس — مگر تابِ گفتار رکھتی ہے بس

اگر یک سرموئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

مسجد قرطبہ کی طرح یہ بھی ایک طویل نظم ہے فنی اور فکری دونوں لحاظ سے اردو کے شاہکار میں اس کا شمار ہے اس کا قالب مثنوی کا قالب ہے مثنوی کا فن غزل کی طرح اردو میں نہایت قدیم ہے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ اب تک ایسی جامع صفات مثنوی منصہ شہود پر نہیں آئی۔

جہاں مسجد قرطبہ اعلیٰ فکری نظم ہے اور فکر کی عظمت کے لحاظ سے وہی طمطراق برتا گیا ہے جو اس کے شایان شان تھا وہاں ساقی نامہ سہل ممتنع اور روانی و سلاست کے اعتبار سے لاثانی ہے۔ کمال یہی ہے کہ اتنے سہل پیرایۂ بیان میں فکر و فن کے تمام گل بوٹے کھلائے گئے ہیں۔

یہ نظم سات بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلا بند روایتی قالب میں ہے سب سے پہلے موسم بہار کی منظر کشی کی گئی ہے اور پھر ساقی سے شراب کی طلب کی گئی۔ یہ شراب نہ تو روایتی تصوف کی شراب ہے اور نہ خم میکدہ کی۔ یہ شراب خودی اور عرفان ذات کی شراب ہے ؎

وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات
وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات

(۲) اگرچہ انقلاب کے لئے تمام ساز و سامان مہیا ہیں مغربی تہذیب دم توڑ رہی ہے اور مشرقی تہذیب میں زندگی کی حرارت پیدا ہو رہی ہے مسلمان بھی از سرنو شرک و غلامی کی زندگی سے لوٹ کر توحید کی طرف آرہا ہے

مگر ابھی عجمی، افکار کی بھول بھلیاں میں پھنس کر حرارت زندگی سے محروم ہوگیا ہے۔

(۳) اس بند میں دعا کی گئی ہے کہ ملت کے جوانوں میں روح حیات پیدا کر دے۔ تمنا، سوز یقین اور اضطراب عمل وجستجو کے جوہر سے ملت اسلامیہ کے افراد کو آراستہ کر دے۔

(۴) چوتھا بند فلسفۂ حیات کا بند ہے۔ زندگی کو سمندر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ وحدت ہے لیکن کثرتوں میں جلوہ آرا ہے اس کا وجود نامی صید و صیاد ہر ایک میں ہے۔

(۵) اس بند میں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کائنات حرکی مزاج ہے۔ زندگی ہر دم حرکت پر آمادہ ہے یہ توالد و تناسل کے ذریعہ اپنی بقا کو برقرار رکھتی ہے۔ اس طرح موت سے زیر ہونا تو درکنار اسی کو مسخر کر لیتی ہے۔

(۶) (۷) آخری دونوں بندوں میں خودی کو نہایت آسان لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

ذوق و شوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں   تہی دست رفتن سوئے دوستاں

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں!
سُرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اِضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دُھل گئے
ریگ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں!
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل، تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!
ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو!
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو!
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو!
خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب!

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ! عقل تمام بولہب!
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد!
عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب!
عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب!

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

گرمیٔ آرزو فراق شورش ہائے وہو فراق
موج کی جستجو فراق، قطرہ کی آرزو فراق

ذوق و شوق بھی عدیم المثال نظم ہے پوری نظم میں عشق رسول کا جذبہ کارفرما ہے۔ حضورؐ کی بعثت اور حضورؐ کے آخر الزمانی ہونے کی کیفیت کو کس کمال کے ساتھ ادا کیا گیا ہے کہ دل شاعر کے فنکارانہ کمال پر وجد کرنے لگتا ہے۔

دیکھو حضورؐ کی بعثت چھٹی صدی میں ہوئی اس وقت قصیدہ نگاری کا بڑا دھوم تھا۔ سبعہ معلقہ کی عظمت اتنی بڑھی کہ ساتوں قصیدے دیوار کعبہ سے لٹکا دیئے گئے۔ ان قصیدوں میں شعرائے جاہلیت اپنے فرضی محبوب کو (جیسے بنت عم کہتے تھے) خطاب کرتے ہیں۔ عام طور پر اس مقام کا ذکر ضرور ہوتا جہاں محبوبہ مذکور کے قبیلہ کے لوگوں کا پڑاؤ پڑتا۔ مگر شعر کہنے کے وقت خیموں اور طنابوں کے نشانات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہے حضورؐ کی بعثت کے عہد کی شاعری کا رُخ جس میں عشق کے والہانہ جذبات کا اظہار فحشیات ہوس پرستی تک ہوتا۔

عہد وسطیٰ کا قصیدہ نگار البوصیری قصیدہ بردہ میں جس والہانہ

شوق کے ساتھ اپنے عشق کا ذکر کرتا ہے وہ جذبۂ صادق سبعہ معلقہ کے خود پرست (اور ہوس پرست) شعرا کو کہاں نصیب۔

آخری عہد کا شاعر خود اقبال ہے

جب وہ کہتا ہے "آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر"

تو شاعر چھٹی صدی عیسوی کے رابطہ کو ڈھونڈھتا ہوا سبعہ معلقہ کے عہد میں پہنچ جاتا ہے اس کا رابطہ عہد وسطیٰ سے بھی ہے اور زمانہ حال سے بھی یعنی حضورؐ کی ذات نے ماضی بعید، ماضی قریب اور زمانہ حال کے جھگڑے کو بھی چکا دیا۔ یہی مفہوم شاعر نے لفظوں میں مسجد قرطبہ میں واضح کیا ہے۔

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے عجیب

عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل

یا پھر تشکیل جدید میں حضور کی بعثت کو قدیم و جدید کا درمیانی رابطہ قرار دیا گیا ہے اسے اس طرح پیش کیا گیا

اسی طرح ذوق و شوق قصیدہ نہیں ہے کیونکہ قصیدہ کے قالب میں نہیں ہے۔ مگر پہلا بند مظاہر فطرت کی عکاسی میں ہے جو تشبیب کے مشابہ ہے۔ دوسرا بند واردات قلبی کے اظہار میں ہے اور یہی گریز بھی ہے تیسرا اور چوتھا بند حضورؐ کی تعریف میں ہے اور آخری بند گلۂ فراق میں ہے۔ ظاہر ہے کہ قصیدہ کے سارے لوازمات شامل ہیں پھر بھی یہ وہ قالب ہے جس کی عہد کہن میں کیا عہد وسطیٰ میں بھی کوئی گنجائش نہ تھی اور ایسا قالب شاعری میں مستعمل نہیں ہوا تھا۔

(۱) یہ بند نواح مدینہ منورہ کا نقشہ پیش کرتا ہے ایک طرف اضم کی پہاڑی سرخ و سیاہ بدلیوں میں ملبوس ہے۔ ہوا گرد سے پاک ہے۔ برگ نخیل دھلے ہوئے ہیں اور نواح کاظمہ (مدینہ) کی ریت ریشم کی طرح نرم ہے۔ اسی پس منظر میں تھوڑی دیر ظاہری نظر کو بند کر کے دل کی آنکھ سے حقیقت ازلی کا نظارہ کر۔ دیکھو یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے بے شمار قافلے گذر چکے ہیں اور ان کے نقوش نمایاں ہیں۔ فراق کے مارے عاشقوں کی یہی جگہ ہے۔

قصیدہ بردہ کا شعر ہے ؎

۱ أم ھبت الریح من تلقاء کاظمۃ

اداومض البرق فی الظلماء من اضم

کیا کاظمہ (مدینہ منورہ) کی جانب سے ہوا چلی ہے، یا اضم کی پہاڑی سے تاریکی میں بجلی چمکی ہے؟

(۲) ملّت اسلامیہ کی بربادی پر شاعر کا دل روتا ہے کیونکہ خود اہل حرم نے صنم خانے تعمیر کر لئے ہیں اور اہل اسلام کے بنائے ہوئے بتوں کو توڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کے اندر وہ سوز و ساز موجود نہیں جو عربی اور عجمی افکار کے نمائندے تھے غرض کہ اہل اسلام کے دل جذبۂ عشق سے عاری ہیں اگرچہ دینی زندگی کی اولین تربیت گاہ عشق ہی ہے۔ حضرت خلیلؑ حضرت حسینؓ اور خود آنحضرتؐ کے معرکے سب کے سب عشق ہی کی جلوہ افروزی کا نتیجہ تھے۔ اہل ملت کی مردہ ضمیری کی وجہ سے غم والم کے اثرات شاعر کے دل پر گہرے ہیں۔

(۳) یہ پورا بند والہانہ عشق کے جذبات کا اظہار ہے حضورؐ کی ذات ہی

باعث تخلیق کائنات ہے۔ کائنات کے اندر کون و فساد کی تمام تر ہما ہمی سے آپ کی ہی جلوہ آرائی مقصود تھی۔ افسوس یہ ہے کہ ارباب مدرسہ اس حقیقت سے روشناس نہیں ہیں۔ آپ کے وصل و قرب کی تمنا جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہے وہی شاعر کے دل میں بھی ہے اس کی غزلیں اور نظمیں محض شاعری نہیں حقیقی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ خلاصۂ کائنات اس رابطہ کو قوی تر فرما دیں جس سے شاعر کا دل ہمیشہ آپ کی محبت میں محو رہے۔

(۴) یہ بند مدح پیمبر میں ہے۔

(۵) حضور پر شاعر کے حالات زندگی بخوبی منکشف ہیں۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ ایسا گزارا ہے جبکہ اس کے دل میں عشق کا جذبہ کامل نہیں تھا۔ ان دنوں وہ علم کو اپنا ہادی سمجھتا تھا یہ اس کی قطعی بھول تھی عقل گمرہی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اور عشق صراط مستقیم کی طرف۔ عشق کے اندر فراق میں لذت طلب بڑھتی ہے۔ شاعر عالم فراق میں آرزو و جستجو کو پروان چڑھا رہا ہے۔ جیسا کہ کائنات کی ہر شے جستجو اور آرزو میں بڑھ رہی ہے۔

زمانہ

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

ہر اک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ

نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیوں کر، بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

جبریل و ابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو!

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے آرزو!

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو!

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو!
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ دورنِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو!
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر!
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے!
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط! اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو

قطعہ

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے درِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات!
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات!
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات!
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات!
ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات!
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات!
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات!
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات!

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات!
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات!
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے!
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات!
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات!
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات!
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات!
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات!
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل!
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات!
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام!
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

"بالِ جبریل" کی غزلیں

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں!

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں!
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں!

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

۲

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اُسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا، وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

۳

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر!

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر!

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر!

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر!

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر!

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر!

۴

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد؟

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد!

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گُل
یہی ہے فصلِ بہاری، یہی ہے بادِ مراد!

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!

مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد!

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد!

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

۵

کیا عشق ایک زندگیِ مستعار کا
کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس!

پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

۶

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے!

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیٔ محفل نہ بن جائے!

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے!

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے!

کہیں اُس عالمِ بے رنگ و بُو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے!

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

۷

دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی!

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی!

۸

لا پھر ایک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی!

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی!

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

تُو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی!

۹

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تُو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو!

نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب
سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خودرو!

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو!

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو!

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو!

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکیِ طینت سے ہے گہر کا وضو!

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو!

۱۰

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

۱۱

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت، وہ نگہ کا تازیانہ

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس نہ آشیانہ

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

۱۲

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز!

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز!

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز!

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!

دلِ غمیں کے موافق نہیں ہے موسمِ گل
صدائے مرغِ چمن ہے بہت نشاط انگیز!

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز!

۱۳

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اِک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

۱۴

یارب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند!

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند!

تو برگِ گیاہے ندہی اہلِ خرد را
او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند!

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

فردوس جو ترا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند!

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند!

درویشِ خدا مست، نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دِلّی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہِ دماوند!

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند!

پُرسوز نظر باز و نکو بین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند!

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند!

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

۱۵

[اعلیٰ حضرت شہید امیر المومنین نادر شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے لطف و کرم سے نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنوی کے مزار اقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشاں جن میں حکیم ہی کے مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے۔

"ما از پئے سنائی و عطار آمدیم"

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا!

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا!

نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ؟

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویسؓ و چادر زہراؓ

حضور حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا!

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانہ کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا؟

محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را

وہ دانائے سُبل ختم الرُّسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ شوق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

۱۶

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز!

گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز!

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز!

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز!

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز!

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز!
یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خوں ریز

۱۷

عالم آب و خاک و باد! سرِّ عیاں ہے تُو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تُو کہ میں؟
وہ شبِ درد و سوز و غم، کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تُو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تُو کہ میں؟
کس کی نمود کے لیے شام و سحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تُو کہ میں؟
تُو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر!
کشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تُو کہ میں؟

۱۸

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفَسِ جبرئیل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں
حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں
عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں
ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں!
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں
علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں!
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں!

۱۹

(لندن میں لکھے گئے)

تو ابھی رہ گزر میں ہے، قیدِ مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر، پارس و شام سے گزر
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر!
گرچہ ہے دلکشا بہت، حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گزر!
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر!
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر!

۲۰

امینِ راز ہے مردانِ حُر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبتِ خویشی!

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے؟ فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں نہ آہِ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی!

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی!

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جانِ پاک جسے

یہ رنگ و نم یہ لہو آب و ناں کی ہے بیشی

۲۱

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح

اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن!

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن؟

من کی دنیا، من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق

تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن!

مَن کی دولت ہاتھ آتی ہے، تو پھر جاتی نہیں
تَن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

مَن کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
مَن کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن!

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ مَن تیرا نہ تن!

۲۲

نہ تو زمیں کے لئے ہے، نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ آشیاں کے لئے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لئے ہے، نہ آشیاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اُسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے!

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

۲۳

تو اے اسیرِ مکاں! لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں!

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں!

کہے نہ راہ نما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو
یہ بات راہروِ نکتہ داں سے دور نہیں!

۲۴

(یورپ میں لکھے گئے)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ!
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ!

نہ بادہ ہے، نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ!

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ!

کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور
سب آشنا ہیں یہاں ایک میں ہوں بیگانہ

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

۲۵

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

۲۶

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت
پربت ضعفِ خودی سے رائی
تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیرِ وجود ہے خدائی
یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند
بے رازو نیاز آشنائی
تیری قندیل ہے ترا دل
تو آپ ہے اپنی روشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

ختم شد